لاؤڈ سپیکر



سعادت حسن منٹو

لاؤڈ سپیکر

لاؤڈ سپیکر

سعادت حسن منٹو

گوشۂ ادب

چوک انارکلی، لاہور

ناشر ____________ ملک مبارک علی
اشاعت ____________ مارچ ۱۹۸۶ء
مطبع ____________
قیمت ____________ ۲۱/ روپے

ملنے کا پتہ
مکتبہ اُردو ادب
بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ، لاہور

چراغ حسن حسرت

کے

نام

عنوانات

دیوان سنگھ مفتون

لغت میں 'مفتون' کا مطلب عاشق بیان کیا گیا ہے۔ اب ذرا اس عاشقِ زار کا حلیہ ملاحظہ فرمائیے۔ ناٹا قد۔ بھدا جسم۔ ابھری ہوئی توند۔ وزنی سر جس پر چھدرے کھچڑی بال جو کیس کہلانے کے ہرگز مستحق نہیں۔ اکٹھے کئے جائیں تو بمشکل کسی کشٹ برہمن کی چوٹی بنے۔ گہرا سانولا رنگ۔ چھوٹی سی گھسی پٹی داڑھی جو شاید کسی زمانے میں داڑھیوں کی لاج رکھتی ہو۔ آنکھیں بڑی نہ چھوٹی۔ مگر بلا کی تیز اور مضطرب۔

بحیثیتِ مجموعی یہ عاشق زار، سردار دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر ہفتہ وار "ریاست" دہلی۔ کسی زمانے میں راجاؤں، مہاراجوں اور نوابوں کا دشمن ان کے راز فاش کرنے والا مداری۔ صحافت میں ایک نئے، خام مگر بہت زوردار

انداز تحریر کا مالک، دوستوں کا دوست بلکہ خادم اور دشمنوں کا ظالم ترین دشمن۔ چمپان ٹائر کا اشتہار معلوم ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس اشتہار میں جو ٹائروں کی بنی ہوئی انسان نما شکل ہے، اُس کے جوڑوں میں درد نہیں ہوتا مگر دیوان سنگھ مفتوں گٹھیا کا مارا ہے۔ اُس کا بند بند اور جوڑ جوڑ درد کرتا ہے ——— آپ اُس کے میز پر قلم دوات کے ساتھ ہر وقت کروشن سالٹ کی بوتل دیکھ سکتے ہیں۔ یہ قلم دان کا ایسا جزو بن کے رہ گئی ہے کہ بعض اوقات آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ دیوان سنگھ اپنا قلم روشنائی میں ڈبونے کے بدلے کروشن سالٹ میں ڈبوتا ہے اور اُسی سے لکھتا ہے۔

جس طرح دیوان سنگھ مفتوں کی کوئی کل سیدھی نہیں، اسی طرح اُس کی تحریر کا کوئی جملہ سیدھا نہیں ہوتا ——— ادب کا خدا جانے کب سے خون کر رہا ہے، لیکن صحافت میں اُس کا وہی رتبہ ہے جو بمبے سینٹینل کے ایڈیٹر آنجہانی بی۔ جی ہارنی مین کا تھا۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں اُس سے بالشت بھر اونچا ہے۔

ہارنی من صرف پولیس سے ٹکر لیتا رہا۔ دیوان سنگھ نے اپنی پہلوانی کے دم خم کئی اکھاڑوں میں دکھائے۔ بڑی بڑی ریاستوں سے پنجہ لڑایا۔ اکالیوں سے متصادم ہوا۔ ماسٹر تارا سنگھ اور سردار کھڑک سنگھ سے تلوار بازی کی۔ مسلم لیگ سے چونکھی لڑا۔ پولیس کو تگنی کا ناچ نچایا۔ خواجہ گیسو دراز حضرت حسن نظامی سے چلبلیں کیں۔ تیس سے کچھ اوپر مقدمے چلوائے اور ہر بار سرخرو

رہا۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں کمائے اور اُڑا ڈالے۔ مفلسی کے زمانے میں اگر کوئی دوست آیا تو چٹکیوں میں چار سو بیس کر کے روپیہ حاصل کیا اور اُس کی تواضع پہ خرچ کر دیا۔ جیبیں لبالب بھری ہونے پر مونٹے کی ہیٹ سائس میں ننگی عورتوں کا رقص دیکھا اور اپنے دوستوں کو دکھایا۔ آپ کم پی اپنے یاروں کو جی بھر کے پلائی۔

دیوان سنگھ مفتون اکائی نہیں۔ دہائی، سینکڑہ، ہزار ہے، دس ہزار ہے بلکہ لاکھ ہے۔ وہ ایک عجائب گھر ہے جس میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں نادر دستاویزات مقفل پڑی ہیں۔ وہ ایک بینک ہے جس کے رجسٹروں میں کروڑوں کا حساب درج ہے۔ وہ اسکاٹ لینڈ یارڈ ہے جس میں لاکھوں جرائم پیشہ انسانوں کے خفیہ حالات موجود ہیں۔

اگر وہ امریکہ میں ہوتا تو وہاں کا سب سے بڑا "گینگسٹر" ہوتا۔ کئی اخبار اُس کے تابع ہوتے۔ بڑے بڑے یہودی سرمایہ دار اُس کے ایک اشارے پر ناچتے۔ وہ رابن ہڈ کا بھی باپ ہوتا۔ مفلسوں کے لئے اُس کی تجوریاں ہر وقت کھلی رہتیں۔

آپ مفتون کو دیکھئے گا تو اُسے معمولی سا پڑھا لکھا ادھیڑ عمر کا سکھ سمجھیں گے۔ لیکن وہ بہت پڑھا لکھا ہے۔ ایک دن میں نے انہیں ریاست کے خوبصورت پیازی رنگ کے کارڈوں پر دستخط کرتے دیکھا۔ کارڈوں کی

دو تین ڈھیریاں لگی تھیں ۔ میں نے ایک کارڈ اٹھا کر ٹائپ شدہ عبارت پڑھی ––– بیرونی ملک کی کسی فرم سے فہرست بھیجنے کی درخواست کی گئی تھی ۔ سب کارڈ اسی مضمون کے تھے ۔ مجھے بہت حیرت ہوئی کہ اتنی فہرستیں منگا کر سردار صاحب کیا کریں گے ۔ میں نے پوچھا "مفتون صاحب، کیا آپ کوئی اسٹور کھولنے والے ہیں"۔

سر کو سکھوں کے مخصوص انداز میں ایک طرف جھٹکا دے کر مفتون خوب ہنسا "نہیں منٹو صاحب ۔ میں یہ فہرستیں منگا رہا ہوں کہ مجھے ان کے مطالعے کا شوق ہے۔"

میری حیرت میں اور اضافہ ہو گیا "آپ مطالعہ فرمائیں گے، یعنی فہرستوں کا ––– حاصل کیا ہوگا ؟"

"معلومات ––– میں اپنی معلومات میں اسی طرح اضافہ کیا کرتا ہوں۔"

"آپ کی جو بات ہے نرالی ہے۔"

"ڈنلپ کمپنی کیا بناتی ہے ؟" ایک دم مجھ سے سوال کیا گیا۔

میں نے جھٹ سے جواب دیا "ٹائر ۔"

اس پہ مجھے بتایا گیا کہ ڈنلپ کمپنی صرف ٹائر، ٹیوب ہی نہیں بناتی اور ہزارہا چیزیں بناتی ہے ۔ گاف بال ۔ ربڑ کے گدے گدیاں ۔ ربڑ اسپرنگ ۔ نلکیاں ۔ ہوز پائپ اور خدا معلوم کیا کیا ––– !

جب فہرستیں آتی ہیں تو وہ ہر ایک کا بغور مطالعہ کرتا ہے۔ اسی لئے میں نے کہا ہے کہ سردار دیوان سنگھ مفتون بہت پڑھا لکھا آدمی ہے وہ تمام فہرستیں پڑھتا ہے۔ جب بیکار ہو جاتی ہیں تو محلے کے بچوں میں تقسیم کر دیتا ہے کہ وہ تصویریں دیکھیں اور خوش ہوں —— بچوں سے اُسے بہت پیار ہے۔

بیرونی ممالک کے کارخانوں کی فہرستیں پڑھ پڑھ کر وہ اپنے پرچے کے زوردار اداریئے لکھتا ہے۔ یہ "ناقابلِ فراموش" کا ناقابلِ فراموش کالم لکھتا ہے۔ سوالوں کے "پٹخنی" جواب دیتا ہے اور فصاحت و بلاغت کا ہر جگہ خون کرتا ہے۔

بہت بدخط ہے جس طرح وہ آپ ٹیڑھا میڑھا ہے، اسی طرح اُس کے قلم سے نکلے ہوئے حروف ٹیڑھے میڑھے ہوتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کاتب اُس کا لکھا ہُوا کیسے پڑھتا ہے۔ مجھے جب بھی اُس کا خط آیا، میں نے "اندازاً" اُس کا مطلب نکالا۔ دوسری مرتبہ غور سے "ڈی سائیفر" کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہُوا کہ میں نے پہلی نظر میں جو مطلب اخذ کیا تھا بالکل غلط تھا۔ تیسری دفعہ پڑھا تو حروف اپنی صحیح شکل اختیار کرنے لگے۔ چوتھے مرحلے پر بالآخر عبارت مکمل طور پر روشن ہوئی۔

دیوان سنگھ مفتون بہت محتاط آدمی ہے۔ محاورہ ہے، دودھ کا جلا

چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ چھاچھ کے علاوہ وہ پانی بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ کاتب کو ہدایت ہے کہ جب اُس کی لکھی ہوئی سلپیں پیلے کاغذ پر منتقل ہو جائیں تو فوراً واپس کر دی جائیں۔ کتابت شدہ سطور میں اغلاط لگانے کے بعد وہ میز پہ پڑی ہوئی کالی صندوقچی کھولے گا اور اُس میں تمام سلپیں ڈال کر اُس کو مقفل کر دیگا اور جب پرچہ چھپ کر آ جائیگا تو اپنی تحریروں کو تلف کر دے گا۔ معلوم نہیں یہ احتیاط کیوں برتی جاتی ہے۔

اُس کی ساری ڈاک ایک تھیلے میں مقفل ہو کر آتی ہے۔ اِسے کھول کر وہ ایک ایک خط، ایک ایک اخبار باہر نکالے گا اور ترتیب وار میز پر رکھتا جائے گا۔ لفافہ کھول کر خط نکالنے کے بعد وہ لفافہ ردی کی ٹوکری میں نہیں پھینکتا بلکہ خط کے ساتھ پن لگا کر منسلک کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ رسالوں اور اخباروں کے "ریپر" بھی ضائع نہیں کرتا۔ میں نے اُس طریقِ عمل کے متعلق پوچھا تو جواب ملا "احتیاط ہر حالت میں اچھی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے، میں کسی اخبار یا رسالے کے خلاف مقدمہ کرنا چاہوں۔ اب قانون یہ ہے کہ اگر لاہور کے کسی اخبار نے میرے خلاف لکھا ہے اور ریپر جس پر میرا نام اور پتہ موجود ہے میں پیش نہیں کر سکتا تو مقدمہ صرف لاہور ہی میں چل سکتا ہے۔ بصورتِ دیگر یہ ریپر اِس بات کا ثبوت ہوگا کہ میری بےعزتی

یہاں دہلی میں ہوئی ہے جہاں مجھے یہ پرچہ ارسال کیا گیا ہے، اس لئے میں یہاں دہلی کی عدالت میں دعوے دائر کر سکتا ہوں۔"

دیوان سنگھ مفتون پر جو آخری مقدمہ (غالباً ستائیسواں) چلا بہت خطرناک تھا۔ وہ اور ایک بنگالی بلاک میکر جعلی نوٹ بنانے کے الزام میں ماخوذ تھے۔ میں اُن دنوں بمبئی میں تھا۔ ایک دن مجھے "مصوّر، دہلی" کی معرفت ایک ٹائپ کیا ہوا خط ملا جس پر کوئی دستخط نہیں تھے۔ ٹائپ میں دیوان سنگھ مفتون لکھا تھا۔ مجھ سے درخواست کی گئی تھی کہ میں گواہ کے طور پر پیش ہوں۔

عرصہ ہوا، میں دہلی گیا تھا اور اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں دفتر پہنچا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ بہت بڑا میز تھا جس کے دونوں طرف ریڈیو پڑے تھے۔ قلمدان کے پاس کروشن سالٹ دو بوتلیں تھیں۔ ایک کونے میں پردے کے پیچھے صوفا نما چیز تھی جس پر غالباً دیوان صاحب استراحت فرماتے ہوں گے۔ سب الماریاں کھلی تھیں۔

میں نے یہ اور دوسری تفصیلات "مصوّر" میں ایک مضمون کی صورت میں شائع کی تھیں اور لکھا تھا کہ اگر اس کمرے میں چھوٹا سا کمپارٹمنٹ بنا دیا جاتا جس میں کموڈ ہوتا تو یہ کمرہ کسی ریل کا بہت بڑا ڈبہ دکھائی دیتا۔

دیوان صاحب نے یہ مضمون سنبھال کے رکھا ہوا تھا۔ جب پولیس نے
چھاپہ مارا کہ اس کمرے کی الماری سے ایک کتاب میں رکھے ہوئے سو سو کے
چھ (غالباً) نوٹ نکالے اور سردار صاحب کی گرفتاری عمل میں آئی تو انھوں
نے مجھے صفائی کے گواہوں میں رکھ لیا۔ اس مضمون سے اور میری گواہی سے
یہ ثابت کرنا مطلوب تھا کہ اُن کے دفتر میں کوئی بھی شخص بے روک ٹوک
آجا سکتا ہے۔

میرا خیال ہے میں دہلی میں دیوان صاحب سے اپنی اس ملاقات کے بارے
میں بھی کچھ لکھ دوں کہ یہ خاصی دلچسپ تھی۔

دیر تک انتظار کرنے کے بعد جب وہ نہ آئے تو میں چلا گیا۔ شام کو آیا
تو وہ دفتر میں موجود تھے۔ ڈنلپ ٹائر کا اشتہار کرسی میں بیٹھا تھا۔ سر پہ چھوٹی
سی سفید پگڑی۔ قلم انگلیوں میں دبائے کچھ لکھ رہے تھے۔ چشمے کے شیشوں
کے پیچھے آنکھیں ایک عجیب انداز میں اوپر کر کے مجھے دیکھا اور یوں اچھلے
جیسے ربڑ کی ٹھوس گیند اچھلتی ہے۔ "تجھ سے یہ گھٹ گھٹ چھپیاں پائیں"
یعنی بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے اور کہا "مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ آئے تھے۔
میں ایک ضروری کام سے باہر گیا ہوا تھا۔"

مجھے بیٹھنے کو کہا۔ بمبئی کے حالات پوچھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں
مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے متوجہ تو ضرور ہیں لیکن اُن کا دماغ کچھ اور

سوچ رہا ہے۔ باتیں کرتے کرتے انھوں نے ٹیلی فون کا رسیور اُٹھایا اور نمبر ملا کر دوسرے سرے ملانے سے کہا۔ میں سُندر لال بول رہا ہوں ——— نئی دلّی سے۔ لالہ ...... ہیں؟ ——— کہاں گئے ہیں؟ ——— اچھا!

آپ کا دفتر پُرانی دلّی میں تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سندر لال نہیں بول رہا تھا۔ دیوان سنگھ مفتون بول رہا تھا۔ دورانِ گفتگو میں آپ نے کئی مرتبہ اسی طرح مختلف نمبر ملائے اور جعلی ناموں سے لالہ ——— کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں ہیں ——— معلوم نہیں کیا چار سو بیس تھی۔ لیکن مجھے اتنا یقین تھا کہ اُس لالے کی شامت آ گئی ہے یا عنقریب آنے والی ہے۔

ٹیلی فون کے ذریعے سے جب کچھ پتہ چلایا نہ چلا تو اُنھوں نے سولھویں مرتبہ مجھے بیئر کی دعوت دینے کے بعد اپنے خاص آدمی (غالباً سردار دیام سنگھ) کو آواز دے کر بلایا۔ اُس کے کان میں ہولے سے کچھ کہا اور رخصت کر دیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے "ہاں منٹو صاحب، تو بیئر منگواؤں آپ کے لئے؟"

میں نے جھنجھلا کر کہا "سردار صاحب زبانی جمع خرچ آپ نے آخر سیکھ ہی لیا دلّی والوں سے ——— منگوائیے۔ منگواتے کیوں نہیں؟"

یہ سُن کر دیوان صاحب خوب کھل کر ہنسے اور اہالیانِ یو۔ پی کو بے نقط سنانے لگے۔ انسانوں کی اس قسم سے اُن کو خدا واسطے کا بیر ہے چنانچہ جب

بھی اُنھیں اپنے دفتر میں کسی ملازم کی ضرورت ہوتی ہے تو اشتہار میں یہ بات خاص طور پر لکھی ہوتی ہے کہ صرف پنجابی درخواست بھیجیں —— لیکن عجیب بات ہے کہ آپ احسان بھیا کو اپنا بہترین دوست یقین کرتے ہیں۔ اُن کے دل میں یوپی کے اس باشندے کا بہت احترام ہے۔

ایک مرتبہ دیوان صاحب کو اپنی موٹر ایک تنگ بازار سے گزارنا تھی میں اُن کے ساتھ تھا۔ موٹر مڑی تو سڑک کے بیچ بیچ کئی چارپائیاں بچھی دکھائی دیں۔ آپ آگ بگولا ہو گئے۔ لگے دلّی والوں اور اُن کی ہفت پشت کو بے نقط سُنانے "کم بختو —— تمھارے اسلاف۔ تمھارے آباؤ اجداد نے بھی اسی طرح چارپائیوں پر دن رات سو سو کر اپنی سلطنت کا بیڑہ غرق کیا تھا —— اب تمھارے پاس کیا رہ گیا ہے جس کا بیڑہ غرق کرو گے۔ خدا تمھارا بیڑہ غرق کرے"

ایک لڑکے نے چارپائی اُٹھانے کی کوشش کی مگر اُس سے نہ اُٹھی۔ دیوان صاحب موٹر سے باہر نکلے اور چارپائی کو اُٹھا کر پھینک دیا۔ "برخوردار تم سے نہ اُٹھتی —— اپنی کمر تو دیکھو —— تمھارے والد بزرگوار یقیناً تم سے بھی کہیں زیادہ نازک ہوں گے۔ اُن سے تو نہانے جاتے وقت لوٹا بھی نہ اُٹھایا جاتا ہوگا۔"

اس پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ اُنھوں نے کرخنداروں کی زبان

ہیں وا ہی تباہی بکنا شروع کیا مگر دیوان صاحب نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ موٹر میں آرام سے بیٹھے اور چلانا شروع کر دی۔

سردار صاحب کو پنجابی بہت پسند ہیں، شاید اس لئے کہ وہ ایک زمانے سے دہلی میں قیام پذیر ہیں، ورنہ یہ حقیقت اُن کی نظروں سے اوجھل نہیں کہ صرف پنجابی ہونا اچھے انسان کی دلیل نہیں۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ اپنے دفتر کی ملازمت کے سلسلے میں پنجابی کی قید لگا کر انھوں نے ہمیشہ فائدہ اُٹھایا۔ کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جتنا نقصان اُن کو پنجابیوں نے پہنچایا ہے اُس کا عشرِ عشیر بھی یو۔پی کے رہنے والوں نے نہیں پہنچایا۔

اب میں اُن کے آخری اور خطرناک مقدمے کی طرف لوٹتا ہوں میں دہلی گیا۔ سردار صاحب ضمانت پر رہا تھے۔ معلوم ہوا کہ ان کو تنگ کرنے کے لئے اُن کے مقدمے کی سماعت دہلی سے بہت دور گوڑگانوہ کی ایک عدالت میں ہو رہی ہے۔ ہم وہاں موٹر میں گئے۔ وکیل نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ مجھے کیا کہنا ہے۔ چنانچہ میری گواہی دس منٹ کے اندر اندر ختم ہو گئی۔

سردار صاحب کو اپنا تحریری بیان پیش کرنا تھا۔ جب حوالات میں تھے تو آپ نے اس کے نوٹ لے لئے تھے۔ اب یہ چھوٹے ٹائپ میں غالباً چالیس پچاس صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اسے جستہ جستہ دیکھا

اور میرا ذہن فرانس کے مشہور مصنّف ایمیل زولا کے شہرۂ آفاق مضمون I ACUSE کی طرف منتقل ہو گیا۔

دیوان سنگھ مفتون کا یہ بیان ملزم کا صفائی کا بیان نہیں تھا، بلکہ فردِ جرم تھی حکومت اور اُس کے کارندوں کے خلاف۔ آخر میں انھوں نے اپنے مقدمات کی فہرست لگا رکھی تھی۔ ہر صفحے پر مختلف خانے بنا کر یہ واضح کیا گیا تھا کہ کون سا مقدمہ کب چلا، کس کی ایما پر چلا، کس کی عدالت میں پیش ہوا اور اُس کا کیا فیصلہ ہوا۔

غالباً بتیس مقدمے تھے۔ ان میں سے اکتیس میں وہ باعزت طور پر بری ہوئے تھے۔ صرف ایک مقدمہ تھا ـــــ بہت بڑا اور بہت مشہور مقدمہ (جو نواب بھوپال نے اُن پر چلایا تھا) جس میں اُن کو شاید صرف اُس عرصے کی سزائے قید دی گئی تھی جو انھوں نے حوالات میں گذارا تھا۔

سردار صاحب نے فاضل جج کے یہ الفاظ خاص طور پر اپنے بیان میں درج کیے ہوئے تھے "میں سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر 'ریاست' دہلی کی ہمت کی داد دیتا ہوں جو اپنے محدود ذرائع کے باوجود طویل عرصے تک ایک شہزادے کا تندہی کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا۔"

نواب بھوپال سے سردار دیوان سنگھ مفتون واقعی بہت دلیری اور ثابت قدمی سے لڑا، لیکن اس جنگ میں اُس کا دیوالہ پٹ گیا۔ جو جمع پونجی

تھی سب پانی کی طرح بہہ گئی۔ کوئی اور ہوتا تو اُس کی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کمر ٹوٹ جاتی، مگر مفتون نے حوصلہ نہ ہارا اور جوں توں اپنا پیارا پرچہ "ریاست" شائع کرتا رہا۔

اُس نے بڑے بڑے آدمیوں سے مقابلہ کیا اور فتح حاصل کی لیکن اپنی زندگی میں ایک آدمی سے شکست بھی کھائی۔ کس سے؟ —— خواجہ حسن نظامی سے۔

سردار صاحب نے ایک دن زچ ہو کر مجھ سے کہا: "میں نے بڑی بڑی قطب صاحب کی لاٹھوں کو جھکا دیا۔ مگر یہ کم بخت حسن نظامی مجھ سے نہیں جھکایا جا سکا۔ منٹو صاحب۔ میں نے اس شخص کے خلاف اتنا لکھا ہے اتنا لکھا ہے کہ اگر ریاست کے وہ تمام پرچے جن میں یہ مضامین چھپتے رہے ہیں اُس پہ رکھ دیئے جائیں تو اُن کے وزن ہی سے اُس کا کچومر نکل جائے —— لیکن اُلٹا میرا کچومر نکل گیا ہے —— میں نے اُس کے خلاف اِس قدر زیادہ اس لئے لکھا کہ میں چاہتا تھا وہ مجبوراً قانون کو پکارے —— کھلی عدالت میں مقدمہ پیش ہو اور میں وہاں اُس کا ڈھول کا پول کھول کے رکھ دوں —— مگر وہ بڑا کائیاں ہے۔ اُس نے مجھے کبھی ایسا موقع نہیں دیا اور نہ دے گا۔"

یہ عجیب بات ہے کہ کسی زمانے میں سردار دیوان سنگھ مفتون اور

خواجہ حسن نظامی میں گاڑھی چھنتی تھی۔ معلوم نہیں کس بات پر وہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے۔

میں پھر مقدمے کی طرف آتا ہوں۔ گوڑگانواں کی عدالت نے اُن کو غالباً دو دفعات کے ماتحت بارہ بارہ برس قید بامشقت کی دو سزائیں دیں۔ سردار صاحب نے گوڑگانواں ہی میں مجھ سے کہہ دیا تھا کہ یہاں کا مجسٹریٹ مجھے کڑی سے کڑی سزا دے گا، چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ لیکن انھوں نے مجھے تسلی دی تھی کہ متفکر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہائی کورٹ میں صاف بری ہو جاؤنگا۔ یہ بھی صحیح ثابت ہُوا۔

ہائی کورٹ نے انھیں باعزّت طور پر بری کر دیا۔

سردار صاحب نے مجھ سے گوڑگانواں میں کہا تھا کہ وہ کچھ عرصہ پہلے شملے میں تھے۔ وہاں ایک پارٹی تھی جس میں سر ڈگلس ینگ (اُس زمانے کے چیف جسٹس) بھی تھے۔ وہ اس کے خلاف بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ سردار صاحب کو حیرت ہوئی جب سر ڈگلس نے اُن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ بہر حال اُن دونوں کی ملاقات ہوئی اور چیف جسٹس نے اُن کے قلم کی توانائی کی بہت تعریف کی اور کہا "میں ایسے آدمیوں کا دوست ہوں۔ اگر میں کبھی تمھارے کام آسکا تو یقین مانناکہ میں تمھاری ضرور مدد کروں گا۔"

جہاں تک میں سمجھتا ہوں سر ڈگلس ینگ کے اس وعدے کو سردار دیوان سنگھ

کی ہدایت کافی وجنی ہونا چاہیئے۔

مقدمہ دیر تک چلتا رہا۔ دیوان صاحب جیل میں تھے۔ اس مقدمے کی روداد بڑی دلچسپ تھی۔ استغاثے کی طرف سے یہ کہانی پیش کی گئی تھی کہ دیوان سنگھ نے کچھ جعلی نوٹ چلانے کی خاطر اپنے دوست جیون لال مٹو کو ایک لفافے میں لاہور بھیجے تھے جو راستے ہی میں پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ لفافے میں ایک ٹائپ کیا ہوا خط بھی تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لیئے کہ یہ خط دیوان صاحب نے اپنے دفتر کے ٹائپ رائیٹر پر تیار کیا تھا، عدالت میں اسے بھی پیش کیا گیا۔

خط میں حرف "او" اور "بی" کے پیٹ کثرت استعمال سے بھر گئے تھے۔

ہائی کورٹ میں جب پیش کردہ ٹائپ رائٹر کی تحریر کا نمونہ لیا گیا تو "او" اور "بی" کے پیٹ بالکل صاف تھے۔ اس کے علاوہ جب صفائی کی طرف سے یہ استفسار کیا گیا کہ لفافہ جو کہ بقول استغاثہ دیوان سنگھ مفتون نے جیون لال مٹو کو بھیجا، اس پہ دہلی کے ڈاکخانے کی مہر گیارہ جنوری کی تاریخ بتاتی ہے اور لاہور کے ڈاکخانے کی مہر ظاہر کرتی ہے یہ لفافہ پندرہ جنوری کو ڈیلور ہوا۔ گیارہ تاریخ کا چلا ہوا لفافہ مکتوب الیہ کو زیادہ سے زیادہ تیرہ تاریخ کی صبح کو مل جانا چاہیئے تھا۔ تاریخیں غلط

ہیں۔ (صحیح تاریخیں مجھے یاد نہیں رہیں)۔ تین دن یہ لفافہ کہاں بھٹکتا رہا۔ یہ سوال اٹھنا تھا کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گا۔ استغاثہ اس کا کوئی معقول جواب نہ دے سکا اور آئیں بائیں شائیں کرتا رہا۔ یہ نکتہ ملزم کو، شک کا فائدہ، بخشنے کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ دہلی میں (آن دنوں میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھا) اخباروں میں یہ خبر دیکھی کہ سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست، دہلی جعلی نوٹ بنانے کے مقدمے میں صاف بری کر دیئے گئے ہیں۔

دوسرے دن صبح آٹھ بجے کے قریب حسن بلڈنگز نکلسن روڈ کے فلیٹ نمبر ۹ (میں یہاں رہتا تھا) کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میری بیوی نے دروازہ کھولا۔ معلوم ہوا کہ دیوان صاحب ہیں۔ میں نے دوڑ کر ان کا استقبال کیا۔ انھوں نے مجھے بازوؤں میں لے لیا اور دیر تک گھٹ گھٹ کر چھپیاں پائیں۔"

پیشتر اس کے کہ میں انھیں مبارکباد دیتا، انھوں نے مجھ سے کہا۔

"سبحان اللہ ۔۔۔۔ لطف آگیا!"

میں نے ان سے پوچھا۔ "کس بات کا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے جیل میں آپ کی کتاب منٹو کے افسانے، پڑھی۔ اس کا انتساب خوب تھا ۔۔۔۔ اخبار دین دنیا کے نام جس میں میرے

خلاف سب سے زیادہ گالیاں چھپیں ــــ میں آج صبح دہلی آیا ہوں۔ جب نے سوچا سب سے پہلے چل کر منٹو صاحب کو داد دینی چاہیئے۔"

اِس سے مجھ پر ثابت ہوا کہ ننّے لطیف آن میں بدرجہا تم موجود ہے۔

ٹائپ رائٹر میں "اد" اور "بی" کی 'کیز' کیسے تبدیل ہوئیں لفاظ اتنی دیر کے بعد کیوں 'ڈی لور' ہوا۔ یہ ایک راز ہے جو سدا راز رہے گا۔ جب میں نے اُن سے اِس بارے میں پوچھا تو وہ یہ کہہ کر ٹال گئے "منٹو صاحب، یہ ہاتھ کی صفائی ہے۔"

ہاتھ کی صفائی ہو بلا پاؤں کی۔ استغاثے کی طبیعت یقیناً صاف ہو گئی تھی۔

دیوان صاحب کو مجھ سے پیار ہے۔ مولانا چراغ حسن حسرت کا وہ احترام کرتے ہیں۔ ہم دونوں دہلی میں تھے۔ اُن کو جب بھی فرصت ہوتی ہمیں ڈھونڈ نکالتے اور کسی دُور دراز خاموش مقام پر لے جاتے۔ وہاں ہم سب بیٹھ کے پیتے، گپیں لڑاتے پھر وہ ہم دونوں کو گھر چھوڑ جاتے۔ ایسی نشستوں میں کوئی سیاسی یا ادبی بات نہیں ہوتی تھی۔

ایک لطیفہ سُنئے جو انھوں نے خود مجھے سنایا۔ انتہائی مفلسی کے دِن تھے کہ اُن کا ایک دوست آن وارد ہوا۔ پہلے تو وہ بہت سٹپٹائے کہ جیب

میں ایک ادھیلا بھی نہیں تھا، لیکن فوراً اُن کو ایک ترکیب سوجھی۔ بارہ
بیئر کی بوتلیں منگائیں۔ دو دوست کو پلائیں، دو خود پئیں۔ باقی آٹھ غسل خانے
میں خالی کر دیں اور نوکر سے کہا جاؤ یہ بارہ خالی بوتلیں بیچ آؤ۔ جنگ کا زمانہ
تھا۔ گوری والی بوتلیں اچھے دام لے آئیں، چنانچہ دوست کو رات کا کھانا
کھلانے کا مسئلہ حل ہو گیا۔ دوسرے تیسرے دن انھوں نے دکاندار کو بارہ
بوتلوں کی قیمت ادا کر دی۔

ایک زمانہ آیا کہ وہ آل انڈیا ریڈیو کے جانی دشمن ہو گئے۔ بس پھر کیا تھا
ہر پروگرام سنتے۔ ایک رجسٹر تھا جس میں کئی خانے بنے تھے۔ اس میں درج تھا کہ
ریڈیو کے کس افسر کا کس گانے والی سے ٹانکا (یہ لفظ اُن کی خاص الخاص
ایجاد ہے) ہے۔

اگر کوئی گانے والی کسی وجہ سے پروگرام میں شریک نہ ہو سکتی اور اس
کی جگہ کسی اور کو گوایا جاتا تو اُن کو فوراً معلوم ہو جاتا، کس افسر کی مہربانی
ہوئی ہے۔

بہت دیر تک وہ ذوالفقار بخاری کے خلاف لکھتے رہے۔ آخر
جگل کشور (حال احمد سلمان ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان) پر پل پڑے
جگل کشور پہلے کلکتے میں تھے۔ دہلی تبدیل ہو کر آئے تو اُن کو وہاں کی ایک
بنگالی نے محبت نامے بھیجنے شروع کئے۔ جگل کو حیرت تھی کہ یہ خط میرے پاس

نہیں پہنچتے، مفتوں کو ملتے ہیں۔ یہ بھی غالباً ہالنڈ کی صفائی تھی۔ بہرحال میں نے منت خوشامد کر کے جنگل صاحب کی گلوخلاصی کرائی اور اُن سے درخواست کی کہ بنگالن کے خطوط مجھے دے دیجئے۔ آپ نے مسکرا کے کہا " میں اتنا بیوقوف نہیں۔ اگر آپ کا دوست یہ خط پڑھنا چاہتا ہے تو میں نقل کرا کے اس کو بھجوا دوں گا۔"

میں نے زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا۔

دہلی میں ایک شخص جو امرتسر کا بعنی میرا ہم شہر تھا سخت پریشانی کے عالم میں میرے پاس آیا۔ اُس کا چھوٹا بھائی ایک لڑکی کو بھگا کر دہلی لے آیا تھا۔ اُس کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے۔ وہ اس معاملے کو سلجھانے کے لئے میری مدد چاہتا تھا۔ میں اُسے دیوان صاحب کے پاس لے گیا۔ انہوں نے سارا ماجرا سن کر حکم دیا اغوا کرنے والے اور مغویہ کو میرے پاس لاؤ۔

دوسرے دن دیوان صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھ سے کہا " وہ لوگ آ گئے تھے ۔۔۔ میں نے سب ٹھیک کر دیا ہے " سب ٹھیک کر ہی دیا ہو گا ورنہ وہ شخص میرے پاس دوبارہ ضرور آتا۔

دیوان سنگھ کی معلومات کے ذریعے بہت وسیع ہیں۔ پاکستان میں کسی کے فرشتے کو بھی معلوم نہیں تھا کہ قائد اعظم زیارت میں خطرناک طور پر علیل ہیں، لیکن "ریاست" میں اس مضمون کا ایک نوٹ، گو بہت ہی دل آزار،

دو ہفتے پہلے شائع ہو چکا تھا جس میں دیوان صاحب نے اپنے مخصوص ظالمانہ انداز میں لکھا تھا کہ قائد اعظم محمد علی جناح بستر مرگ پہ ہیں، لیکن میری دعا ہے کہ زندہ رہیں اور پاکستان کو . . . .

اب ریاستیں نہیں رہیں۔ راجے ہیں نہ مہاراجے جو اُس کے دل پسند کھلونے تھے، مگر سردار دیوان سنگھ مفتون نے یقیناً اور کھلونے چُن لئے ہوں گے۔ راجہ نہیں ہوگا کوئی وزیر ہوگا۔ مہارانی نہیں ہوگی تو کسی بہت بڑے سرمایہ دار کی کمّل کھیلنے والی دھرم پتنی ہوگی۔ مفتون کا جنون کیسے فارغ بیٹھ سکتا ہے۔

لوگ اُسے بلیک میلر، دغا باز، چور اُچکا کہتے ہیں، مگر وہ اپنے پہلو میں انسانیت دوست دِل رکھتا ہے۔ پچھلے فسادات میں اُس نے جتنے مسلمانوں کو خونخوار سِکھوں اور ہندوؤں سے بچایا، جتنی مسلمان عورتوں اور اُن کے بچّوں کو پناہ دی۔ ان کے دل سے اُس کے لئے جو دعائیں نکلی ہوں گی، میرا خیال ہے کہ وہ اُس کی مغفرت کے لئے کافی ہیں۔

پچھلے دنوں میں سخت بیمار تھا۔ میو ہسپتال کے اے وارڈ میں مجھ پہ نیم بے ہوشی اور بے ہوشی دس پندرہ روز تک طاری رہی۔ میری بیوی اور بہن نے مجھے بتایا کہ اس عالم میں بار بار میں سردار دیوان سنگھ مفتون کو یاد کرتا تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ دلّی میں ہوں، ریاست کا دفتر کچھ دُور ہے مگر وہاں ٹیلی فون کیا جا سکتا ہے۔ میں اُن سے کہتا ما جاؤ ٹیلی فون کرو اور

دیوان صاحب سے کہو کہ منٹو بلا رہا ہے آپ کو بہت ضروری کام ہے۔

وہ سمجھاتے تھے کہ تم لاہور میں ہو، لیکن میں بضد تھا کہ نہیں میں دلّی میں ہوں۔ تم جاؤ اور دیوان صاحب کو ٹیلی فون کرو۔ وہ فوراً آجائیں گے۔

گو اُن دنوں عالمِ برزخ میں تھا۔ ہونے نہ ہونے کے درمیان معلّق تھا میرا دماغ دُھند میں لپٹا ہوا تھا، مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جہاں میرا بستر تھا، اُس سے کچھ دُور فاصلے پر ایک دروازہ تھا۔ اس کے آگے ایک بہت بڑا ہال جس میں دو یوروپی بچے پنگ پانگ کھیلتے رہتے تھے۔ اس کو طے کر جائیے تو باہر پلازا سینما (دہلی) کا گیٹ آجاتا۔ مگر افسوس کہ یہ ہر وقت بند رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں بار بار لوگوں سے درخواست کرتا کہ وہ ٹیلی فون کر کے سردار دیوان سنگھ مفتون کو بُلائیں۔ مجھے کون سا ضروری کام تھا، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ میرے قریب قریب ماؤف دماغ میں صرف دیوان صاحب کی یاد کیسے باقی رہی۔

نور جہاں

میں نے شاید پہلی مرتبہ نور جہاں کو فلم "خاندان" میں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں وہ بڑی بڑی تھی، حالانکہ پردے پر وہ ہرگز ہرگز اس قسم کی چیز معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے جسم میں وہ تمام خطوط، وہ تمام قوسیں موجود تھیں، جو ایک جوان لڑکی کے جسم میں ہو سکتی ہیں، اور جن کی وہ بوقتِ ضرورت نمائش کر سکتی ہے۔

"نور جہاں" ان دنوں فلم بین لوگوں کے لئے ایک فتنہ تھی، قیامت تھی۔ لیکن مجھے اس کی شکل و صورت میں ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ ایک فقط اس کی آواز قیامت خیز تھی۔ سہگل کے بعد میں نور جہاں کے گلے سے متاثر ہوا۔ اتنی صاف شفاف آواز، مرکیاں اتنی واضح، کھرج اتنا ہموار،

پنجم اتنا تو کھیلا۔ میں نے سوچا اگر یہ لڑکی چاہے تو گھنٹوں ایک سُر پر کھڑی رہ سکتی ہے، اسی طرح جس طرح بازی گر تنے ہوئے رستے پر بغیر کسی لغزش کے کھڑے رہتے ہیں۔

'نورجہاں' کی آواز میں اب وہ لوچ، وہ رس، وہ بچپنا، وہ معصومیت نہیں رہی، جو اس کے گلے کی امتیازی خصوصیت تھی لیکن پھر بھی 'نورجہاں' نورجہاں ہے۔ گو لتا منگیشکر کی آواز کا جادو آج ہر جگہ چل رہا ہے، پر کبھی نورجہاں کی آواز فضا میں بلند ہو، تو کان اس سے بے اعتنائی نہیں برت سکتے۔

نورجہاں کے متعلق بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ وہ راگ ودیا اتنا ہی جانتی ہے، جتنا کوئی اُستاد۔ وہ ٹھمری گاتی ہے، خیال گاتی ہے، دھرپد گاتی ہے، اور ایسا گاتی ہے کہ گانے کا حق ادا کرتی ہے۔ موسیقی کی تعلیم تو اُس نے یقیناً حاصل کی تھی کہ وہ ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی جہاں کا ماحول ہی ایسا تھا۔ لیکن ایک چیز خداداد بھی ہوتی ہے۔ موسیقی کے علم سے کسی کا سینہ معمور ہو، مگر گلے میں رس نہ ہو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ خالی خولی علم سننے والوں پر کیا اثر کر سکے گا۔

نورجہاں کے پاس علم بھی تھا اور وہ خداداد چیز بھی جسے گلا کہتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں مل جائیں تو قیامت کا برپا ہونا لازمی ہے۔

میں یہاں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ وہ لوگ جن پر خدا کی مہربانی ہوتی ہے، وہ اس سے ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ میرا مطلب ابھی آپ پر واضح ہو جائے گا۔

چاہیئے تو یہ کہ جو چیز خدا نے عطا کی ہو اس کی حفاظت کی جائے تاکہ وہ مسخ نہ ہو۔ لیکن میں نے اکثر دیکھا ہے کہ لوگ ان کی پروا نہیں کرتے۔ بلکہ غیر شعوری یا شعوری طور پر پوری کوشش کرتے ہیں کہ وہ تباہ و برباد ہو جائے۔

شراب گلے کے لئے سخت غیر مفید ہے۔ لیکن سہگل مرحوم ساری عمر بادہ نوشی کرتے رہے۔ کھٹی اور تیل کی چیزیں گلے کے لئے تباہ کن ہیں، یہ کون نہیں جانتا، مگر نور جہاں پاؤ پاؤ بھر تیل کا اچار کھا جاتی ہے اور لطف کی بات یہ ہے، کہ جب اسے فلم کے لئے گانا ہوتا ہے تو وہ خاص اہتمام سے پاؤ بھر اچار کھائے گی۔ اس کے بعد برف کا پانی پیئے گی۔ پھر مائیکروفون کے پاس جائے گی۔ اس کا یہ کہنا ہے، کہ اس طرح آواز نکھر جاتی ہے۔

یوں آواز کیونکر نکھرتی ہے۔ گلا کیسے صاف ہوتا ہے۔ اس کے متعلق نور جہاں ہی جانتی ہے۔ یوں میں نے اشوک کمار کو بھی برف استعمال کرتے دیکھا ہے۔ جب اسے گانے کی صدابندی کرانا ہوتی ہے تو سارا وقت برف کے ٹکڑے چباتا رہتا ہے۔

جب تک ریکارڈ زندہ ہیں۔ سہگل مرحوم کی آواز کبھی نہیں مر سکتی۔ اسی طرح نورجہاں کی آواز بھی ایک عرصے تک زندہ رہے گی اور آنے والی نسلوں کے کانوں میں اپنا شہد ٹپکاتی رہے گی۔

نورجہاں کو میں نے صرف پردے پر دیکھا تھا۔ میں اس کی شکل و صورت اور اداکاری کا نہیں، اس کی آواز کا شیدا تھا۔ وہ کم عمر تھی، اس لئے مجھے حیرت تھی کہ وہ کیونکر اتنے دلفریب طریقے پر گا سکتی ہے۔ اُن دنوں دو آدمیوں کا دَور دَورہ تھا، مرحوم سہگل کا اور نورجہاں کا؛

یوں تو اُن دنوں خورشید چھائی ہوئی تھی۔ شمشاد کے بھی چرچے تھے مگر نورجہاں کی آواز میں سب کی آواز دب گئی۔

ثریا بعد کی پیداوار ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ سہگل اور ثریا اکٹھے فلم میں پیش ہوئے لیکن نورجہاں اور وہ دونوں الگ الگ رہے معلوم نہیں، پروڈیوسروں کے دماغ میں ان کو یکجا کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا یا کسی اور وجہ سے پروڈیوسر ان کو ایک فلم میں کاسٹ نہ کر سکے۔ بہرحال مجھے اس کا افسوس ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اگر وہ دونوں آمنے سامنے ہوتے، تو موسیقی کی دُنیا میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا ہوتا۔

نورجہاں سے میری پہلی ملاقات کیسے ہوئی، کب ہوئی، کہاں ہوئی، یہ ایک لمبی داستان ہے ——— میں کئی برس بمبئی کی فلمی دُنیا میں رہ کر چند وجوہ

کی بنا پر دل برداشتہ ہو کر دہلی چلا گیا۔ وہاں میں نے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ مگر یہاں سے بھی دل اچاٹ ہو گیا۔ بمبئی سے مدیر مصور کے ایڈیٹر نذیر لدھیانوی کے متعدد خطوط آئے کہ تم واپس چلے آؤ۔ خاندان کے ڈائرکٹر شوکت حسین رضوی یہاں آئے ہوئے ہیں اور میرے پاس ٹھہرے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ تم ان کے لئے ایک کہانی لکھو۔

میں دہلی چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کرپس مشن فیل ہو چکا تھا۔ میں غالباً ۷۔ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی پہنچا۔ شوکت سے میری پہلی ملاقات ۱۷ اڈیلفی چیمبرز کلیئر روڈ پر ہوئی جو دفتر بھی تھا، اور رہائشی مکان بھی۔

بڑا بانکا چھبیلا نوجوان تھا۔ گورا رنگ، گالوں پر سرخی۔ مہین مہین جون گلبرٹ اسٹائل کی مونچھیں۔ گھنگھریالے بال۔ لمبا قد۔ بہت خوش پوش۔ بے داغ پتلون شکنوں سے بے نیاز کوٹ۔ ٹائی کی گرہ نہایت عمدہ۔ چال میں لٹک۔ ہم پہلی ملاقات ہی میں گھل مل گئے۔

میں نے اس کو بہت مخلص انسان پایا۔ میں دہلی سے اپنے ساتھ اپنے پسندیدہ سگرٹوں یعنی کریون اے کا کافی اسٹاک لے کر آیا تھا۔ جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اس لئے بمبئی میں یہ سگرٹ قریب قریب نایاب تھے۔ شوکت نے میرے پاس جب پچیس ڈبے اور پچاس کے قریب ڈبیاں دیکھیں

تو بہت خوش ہوا۔

ہم دونوں کا قیام وہیں ۱۰۷۔ اڈلفی چیمبرز میں تھا۔ دو کمرے تھے جہازی سائز کے، ایک میں دفتر تھا، دوسرے میں رہائشی معاملہ۔ مگر ہم رات کو دفتر میں سوتے تھے۔ مرزا مشرف وغیرہ آجاتے تھے۔ وہ ہماری چارپائیاں بچھا دیتے تھے۔

جب تک شوکت وہاں رہا۔ بڑے ہنگامے رہے۔ کریون اے کے سگرٹ اور ناسک کی ہرن مارکہ وسکی جو بڑی واہیات تھی لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ شوکت "خاندان" کے بعد گو بہت بڑا ڈائرکٹر بن گیا تھا، مگر لاہور سے بمبئی پہنچنے اور وہاں کچھ دیر رہنے کے دوران میں وہ سب کچھ خرچ ہو چکا تھا جو اس نے لاہور میں فلم کی ہنگامی اور اخراجات سے پر زندگی گذارنے کے بعد پس انداز کیا تھا ___ اور میرے پاس تو صرف چند سو تھے جو ہرن مارکہ وسکی میں غرق ہو گئے۔

بہر حال کسی نہ کسی حیلے گذر ہوتا رہا۔ وہ وقت بہت نازک تھا۔ میں سات اگست کو وہاں پہنچا اور نو اگست کی صبح کو جب میں نے کہیں ٹیلی فون کرنے کی کوشش کی تو لائن "ڈیڈ" یعنی مردہ تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ کانگریسی لیڈروں کی گرفتاری چونکہ عمل میں آرہی تھی۔ اس لئے احتیاطاً ٹیلی فون کا سارا سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور ابوالکلام آزاد وغیرہ سب گرفتار کر کے کسی نامعلوم جگہ منتقل کر دیئے گئے۔ شہر کی فضا بالکل ایسی تھی جیسی بھری بندوق۔ باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کئی دن ہم ہرن مارکہ شراب پی کر وقت کاٹتے رہے۔ اس دوران میں فلم انڈسٹری میں بھی انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ حالات چونکہ غیر یقینی تھے۔ اس لئے کسی نئے فلم کی تیاری کون کرتا۔ چنانچہ جن لوگوں سے شوکت کی بات چیت ہو رہی تھی۔ ایک غیر معین عرصے کے لئے کھٹائی میں پڑ گئی، اور ہم نذیر لدھیانوی کے ہاں پکے ہوئے بدمزہ کھانے کھا کر لمبی تان کر سوتے رہے۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھار زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے اور ہم کہانیوں کے متعلق سوچنا شروع کر دیتے تھے۔

اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ نور جہاں بھی بمبئی میں ہے — لیکن کتنے ہیں آپ کو بتاؤں کہ مجھے کیسے معلوم ہوا، میرا حافظہ جواب دے گیا تھا۔ اصل میں مجھے ۹ اگست ہی کو معلوم ہو گیا تھا جبکہ میری ملاقات شوکت سے نہیں ہوئی تھی۔

مجھے باہر جا کر اپنے چند رشتہ داروں سے ملنا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے ایک ریڈیو آرٹسٹ تنیہ کا پتہ لینا تھا (بعد میں کرشن چندر سے جس کے مراسم رہے) اس لڑکی کو میں نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے بمبئی بھیجا تھا

کہ اس کو فلم میں کام کرنے کا شوق تھا۔ میں نے اُس کو پرتھوی راج اور برج موہن کے نام تعارفی خط لکھ کر دے دیئے تھے۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ فلمی دنیا میں داخل ہو چکی ہے یا نہیں ـــ لڑکی ذہین تھی، کردار اس کا بہت اچھا تھا۔ مکالمے بہت روانی کے ساتھ ادا کرتی تھی، شکل صورت کی بھی خاصی تھی۔ اس لئے مجھے یقین تھا کہ وہ کامیاب ہو گئی ہو گی۔

مجھے پتہ چلا کہ وہ شیواجی پارک میں کہیں رہتی ہے مگر یہ اتنی بڑی جگہ ہے کہ تنبیہ خاتون کا پتہ لگانا بہت مشکل تھا۔ میں چنانچہ نظامی صاحب کے ہاں روانہ ہو گیا جو پاس ہی کیڈل روڈ پر رہتے تھے مجھے ان کا اڈریس معلوم تھا کہ وہ اکثر مجھے خط لکھتے رہتے تھے۔ یہ وہی نظامی ہیں جنھوں نے ممتاز شانتی کو تربیت دی۔ جن کے پاس ولی صاحب برسوں پڑے رہے اور آخر میں ممتاز شانتی کو نظامی صاحب کے بتائے ہوئے اصولوں ہی کے ماتحت لے اُڑے۔ یہ وہی نظامی صاحب ہیں جن کی بیوی گیتا نظامی کے نام سے فلمی دنیا میں مشہور ہوئی اور جس نے نظامی صاحب کے لات مار کر پے در پے کئی شادیاں کیں۔ عدالتوں میں جس کے کئی مقدمے چلے اور جو اب ایک نئی خوبصورت لڑکی کے ساتھ ڈانس پارٹی بنا کر شہر بہ شہر پاکستان کا پرچار کر رہے ہیں۔

نظامی صاحب سے میری ملاقاتیں صرف خطوط تک محدود تھیں

اور وہ بھی جو بڑے رسمی تھے۔ میں نے ان کو پہلی مرتبہ ان کے فلیٹ پر دیکھا۔ میں اگر اس ملاقات کو بیان کروں تو میرا خیال ہے دس پندرہ صفحات کی نذر ہو جائیں گے۔ اس لئے میں اختصار سے کام لوں گا۔

نظامی صاحب جو کہ دھوتی اور بنیان پہنے تھے۔ مجھ سے بڑے تپاک سے ملے۔ انھوں نے میرے آنے کا مقصد پوچھا، جو میں نے عرض کر دیا۔ آپ نے کہا: "ثمینہ خاتون ابھی آپ کے قدموں میں حاضر ہو جائے گی۔"

ان کا ایک مریل قسم کا ہندو منیجر تھا اس کو آپ نے حکم دیا کہ منٹو صاحب کے لئے فوراً ثمینہ خاتون کو حاضر کرو۔ یہ حکم سننے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ وہ میرے لئے ہر قسم کی خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ چنانچہ انھوں نے فوراً زبانی طور پر میرے لئے ایک عمدہ فلیٹ بمعہ فرنیچر اور ایک عمدہ کار کا بندوبست کر دیا۔

ظاہر ہے کہ میں بہت خوش ہوا۔ چنانچہ میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کیا، جس کی ان کو بالکل ضرورت نہیں تھی اس لئے کہ وہ میرے افسانوں کے گرویدہ تھے۔

قارئین سے مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نظامی صاحب زبانی جمع خرچ کے بادشاہ ہیں۔

نظامی کچھ بھی ہو۔ لوگ اسے بھڑوا کہتے ہیں، کنجر کہتے ہیں۔ کچھ بھی

ہو۔ مجھے اس کا حاروداں بعد معلوم نہیں، لیکن میرا مطالعہ یہ کہتا ہے کہ وہ ایک مہم جو انسان ہے۔ وہ اپنے فن میں پوری پوری مہارت رکھتا ہے۔ میں نے اس روز یعنی پہلی ملاقات کے دن دیکھا کہ ممتاز شانتی پر اس کا اتنا رعب داب تھا کہ کسی باپ کا بھی نہیں ہو سکتا، اور ولی صاحب اس کے سامنے یوں جھکتے تھے جیسے کوئی سائیس۔

وہ اس گھر کا بادشاہ تھا جس کو سب خراج ادا کرتے تھے اس کا کام صرف پروڈیوسروں کو کھانے اور شراب کی دعوتیں دینا تھا۔ بلیک مارکیٹ سے پٹرول خریدنا تھا اور ممتاز شانتی کو کامیاب ہونے کے گر بتانا تھا کہ دیکھو اگر تم یوں مسکراؤ گی۔ تو فلاں پروڈیوسر سے تمہیں کنٹریکٹ لینے کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ اگر تم فلاں سیٹھ سے یوں ہاتھ ملاؤ گی تو اس کا مطلب ہے کہ دس ہزار روپے اسی رات تمہاری جیب میں ہوں گے۔

میں وہاں بیٹھا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ میں کس دنیا میں آ نکلا ہوں۔ وہاں ہر چیز مصنوعی تھی۔ ولی صاحب، نظامی صاحب کے حکم پر ان کا سلیپر اُٹھا کے لائے اور جھک کر ان کے قدموں میں رکھ دیئے۔ اس میں بناوٹ تھی۔ خدا کی قسم یکسر بناوٹ تھی۔

اور ممتاز شانتی دوسرے کمرے میں معمولی لباس میں۔ نہایت معمولی لباس میں کھڑکی کے پردوں کے لئے کیلیں ٹھونک رہی تھی، اور نظامی

کہہ رہا تھا۔ "منٹو صاحب! یہ بچی نہایت سادہ ہے۔ فلم لائن میں رہ کر بھی اسے آس پاس کی دُنیا کا کچھ علم نہیں۔ مردوں کی طرف تو یہ نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھتی۔ اور یہ سب میری تربیت کا نتیجہ ہے۔"

میرا دل کہتا تھا کہ یہ سب فراڈ ہے۔ یہ سب جعل ہے، لیکن مجھے نظامی صاحب کی اُن کے مُنہ کے سامنے تعریف کرنا پڑی۔

لیکن بات نور جہاں کی ہو رہی تھی۔

ممتاز شانتی کو سیدھے راستے پہ لگانے اور اس کو صالح تربیت دینے کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں تو نظامی صاحب نے نور جہاں کا ذکر کیا اور مجھے بتایا کہ ان دنوں وہ بھی ان کے زیر سایہ ہے اور ممتاز شانتی کی طرح تربیت حاصل کر رہی ہے۔ آپ نے کہا: "منٹو صاحب، اگر یہ لڑکی زیادہ دیر لاہور میں رہتی تو اس کا بیڑہ غرق ہو جاتا۔ میں نے اسے یہاں اپنے پاس بُلا لیا ہے اور سمجھایا ہے کہ دیکھو بیٹا صرف فلم اسٹار بننے سے کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی سہارا بھی ہونا چاہیئے۔ اوّل تو شروع میں عشق لڑانے کی ضرورت نہیں۔ اِدھر اُدھر دونوں طرف سے خوب کماؤ۔ جب بینک میں تمہارا کافی روپیہ جمع ہو جائے تو کسی ایسے شریف آدمی سے شادی کر لو جو ساری عمر تمہارا غلام بن کے رہے۔ آپ کا کیا خیال ہے منٹو صاحب۔ آپ تو بڑے دانا ہیں۔"

میری ساری دانائی تو نظامی صاحب کے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی نیچے فٹ پاتھ پر بھاگ گئی تھی۔ میں کیا جواب دیتا۔ بس کہہ دیا کہ آپ جو کر رہے ہیں مصنف کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے چنانچہ انھوں نے آواز دے کر نور جہاں کو بلایا مگر اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور چند لمحات کے بعد نور جہاں کی آواز کسی کمرے سے آئی۔

"ابھی آتی ہوں۔ کمال صاحب کا فون آیا ہے۔"

نظامی صاحب زیرِ لب مسکرائے۔ "یہ کمال، سید کمال حیدر امروہی ہیں ۔۔۔ پکار کے شہرت یافتہ"۔ نظامی صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے "میں عرض کر رہا تھا کہ سہارا ہونا چاہیئے۔ تو نور جہاں کے لئے کمال امروہی سے بہتر سہارا اور کون ہو سکتا ہے۔ لیکن میں اس سے صاف صاف کہہ چکا ہوں کہ شادی وادی کا معاملہ غلط ہے۔ بس اپنا الّو سیدھا کئے جاؤ۔ کمال کما سکتا ہے۔ اس کی آدھی کمائی اگر نور جہاں کو مل جایا کرے تو کیا ہرج ہے ۔۔ اصل میں منٹو صاحب۔ ان ایکٹرسوں کو روپیہ کمانے کے گُر آنے چاہئیں۔"

میں نے مسکرا کر کہا: "آپ گُرو جو موجود ہیں۔"

نظامی خوش ہو گیا اور اس نے مجھے فوراً ایک فسٹ کلاس لیمن سکواش پلایا۔

بس یہاں —— نظامی صاحب کے فلیٹ میں جہاں نورجہاں کی سائنٹیفک طریقے پر تربیت ہو رہی تھی۔ اس کو وہ تمام چلتر خاص نظامی صاحب کی نگرانی میں سکھائے جا رہے تھے۔ میری نورجہاں سے سرسری ملاقات ہوئی، اور میرا اندازہ مکمل یہ تھا کہ یہ لڑکی جوانی کی منزلیں بڑی سرعت سے طے کر رہی ہے اور جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ہنسی تجارتی رنگ اختیار کر رہی ہے، اور موٹاپے کی طرف مائل ہے اپنے استاد کی بہترین شاگرد ثابت ہوگی۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

نظامی کی دراصل یہ خواہش تھی کہ جس طرح ممتاز شانتی اس کے قبضے میں ہے اور اس کا رعب داب تسلیم کرتی ہے۔ اسی طرح وہ بوڑھی نائکہ کی طرح نورجہاں کو بھی اپنی نوچی بنائے۔ ممتاز شانتی کی ساری آمدن نظامی کی تحویل میں رہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ممتاز شانتی کے مقابلے میں نورجہاں کی قدر و قیمت بہت زیادہ تھی، اور نظامی کا ہوشیار دماغ اچھی طرح جانتا تھا کہ نورجہاں کا مستقبل خیرہ کن ہے، چنانچہ وہ اس کو اپنے جال میں پھنسانے کی تیاریاں مکمل کر رہا تھا کہ ——

سید شوکت حسین رضوی بمبئی پہنچ گیا۔ وہ شوکت، وہ رضوی جس سے نورجہاں کا عشق پنچولی اسٹوڈیوز میں لڑ چکا تھا۔ مقدمہ بازی

بھی ہو چکی تھی اور بچنے کی خاطر نورجہاں نے عدالت میں یہ بیان دیا تھا کہ شوکت صاحب سے اس کا کوئی ناجائز تعلق نہیں، وہ تو انھیں اپنا بھائی سمجھتی ہے۔

نورجہاں کا یہ عدالتی بھائی اب بمبئی میں موجود تھا۔ وسیع و عریض بمبئی میں جو ہندوستان کی فلمی دنیا کا ہالی وڈ تھا۔

میں نے شوکت سے بات کی کہ میں نورجہاں سے ملا ہوں۔ اس وقت مجھے ان کے رومان کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا، نہ میں یہ جانتا تھا کہ دونوں کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ میں نے صرف برسبیل تذکرہ اس کو بتایا تھا کہ نورجہاں سے میری ملاقات نظامی صاحب کے گھر میں ہوئی ہے۔ ہرن مارکہ شراب کا گلاس زور سے تپائی پر رکھ کر اس نے بڑی تندی سے کہا "لعنت بھیجو اس پر۔"

میں نے از راہِ مذاق کہا "میں ہزار بار اس کے لئے تیار ہوں۔ مگر بھئی وہ تو تمہارے خاندان کی ہیروئن رہ چکی ہے۔"

شوکت ذہین ہے۔ فوراً سمجھ گیا کہ میں لفظ "خاندان" پر کھیلا ہوں اور اسے زومعنی میں استعمال کیا ہے۔ مسکرا دیا "منٹو تم بہت شریر ہو۔ لیکن بات یہ ہے کہ میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بمبئی میں ہے۔ سالی میرے پیچھے پیچھے آئی ہے۔ لیکن مجھے

اب اس سے کوئی سروکار نہیں۔"

میں نے جب اس کو بتایا کہ وہ کمال امروہی کو ٹیلی فون کر رہی تھی اور یہ کہ نظامی ان دونوں کو قریب لانا چاہتا ہے تو میں نے محسوس کیا کہ گو وہ بظاہر بے اعتنائی اور بے پروائی ظاہر کر رہا ہے، مگر اندرونی طور پر سخت بے چین ہو گیا ہے۔ اس نے فوراً ہرن مارکہ وسکی کا ایک اور ادھا مرزا مشرق سے منگوایا اور ہم رات دیر تک پیتے رہے۔

اس دوران میں لمبے وقفوں کے بعد نورجہاں کا ذکر چھڑ جاتا تھا میں نے شوکت کی گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ ابھی تک اسکی محبت میں گرفتار ہے۔ بھائی والا معاملہ تو محض حکمت عملی تھا۔ اُس کو وہ باتیں یاد آرہی تھیں جب نغموں کی ننھی منی شہزادی اس کے آغوش میں ہوتی تھی اور جب غالباً دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

میں نے ایک دن شوکت سے پوچھ ہی لیا ـــ "دیکھو یار بتاؤ۔ سچ تو سچ بتاؤ ـــ کیا تمہیں نورجہاں سے محبت نہیں ہے؟"

شوکت نے زور سے اپنے سگرٹ کی راکھ جھاڑی اور کسی قدر کھسیانے پن سے کہا "ہے یار ـــ ہے ـــ مگر لعنت بھیجو اُس پر۔ میں اُس کو آہستہ آہستہ بھول جاؤں گا۔"

لیکن قدرت زیرِ لب مسکرا رہی تھی، وہ جو فیصلہ کر چکی تھی، اٹل تھا۔
شوکت کا کنٹریکٹ سیٹھ ڈی۔ ایم دیاس سے ہؤا۔ جو اس سے پہلے
ایک فلم کے لئے نور جہاں سے معاہدہ کر چکا تھا۔

اب لگے ہاتھوں سیٹھ ڈی۔ ایم دیاس کے متعلق بھی کچھ سن لیجئے
ایک نمایاں آدمی ہے۔ شروع شروع میں طبلچی تھا۔ پھر کیمرہ قلی ہؤا۔
آہستہ آہستہ کیمرہ مین بن گیا۔ ترقی کے اور زینے طے کئے تو ڈائرکشن کا
موقعہ مل گیا۔ یہاں سے چھلانگ لگائی تو پروڈیوسر۔ اب وہ ڈائرکٹر اور
پروڈیوسر ہے اور لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔

بہت منحنی قسم کا انسان ہے۔ مجھ سے بھی کہیں پتلا! اتنا پتلا کہ اسے
قمیص کے نیچے ایک موٹا اونی بنیان پہننا پڑتا ہے، کہ اس کی
پسلیاں لوگوں کو نظر نہ آئیں۔ مگر بلا کا پھرتیلا ہے اور بڑا محنتی۔ اس
کے مقابلے میں پہلوان تھک جائیں گے مگر وہ ڈٹا رہے گا جیسے مشقت
اس پر اثر انداز ہو ہی نہیں سکتی۔

اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی سرمائے سے فلم نہیں بناتا
ایک فلم تیار کرکے اور اس کو ٹھکانے لگا کر وہ اپنے دوسرے فلم کا
اعلان کر دیتا ہے۔ اس وقت کے جتنے اونچے ستارے ہوتے ہیں وہ اپنی
کاسٹ میں جمع کر لیتا ہے۔ کہانی کا اس وقت نام و نشان تک نہیں ہوتا۔

رائی نہ کرنی "فانی نینسر" اس کے دام میں آجاتا ہے، چنانچہ اس سے روپیہ لے کر وہ کالا مانا کا نام لے کر کام شروع کر دیتا ہے۔

نورجہاں بمبئی آئی تو اس کو پتہ چل گیا۔ چنانچہ اس نے فوراً اس سے کنٹریکٹ کر لیا۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ "خاندان" اور دوسرے فلموں کی قابلِ رشک کامیابی کے بعد اس کا نام ہی کسی "فانی نینسر" کو پھانسنے کے لئے کافی ہے۔ اور جب اس کو معلوم ہوا کہ "خاندان" کا ڈائریکٹر بھی بمبئی میں موجود ہے تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے فوراً اپنے کارندے دوڑائے۔ شوکت حسین رضوی سے کئی ملاقاتیں کیں، اور اس کے ساتھ بھی ایک پکچر کا معاہدہ کر لیا۔

فلم کیا ہوگا۔ کیسا ہوگا۔ کہانی کیا ہے، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا مگر سیٹھ دی ایم دیاس نے جب اپنے "فانی نینسر" کو نورجہاں اور شوکت سے اپنی "سن رائز پکچرز" کے کنٹریکٹ دکھائے۔ تو مطلوبہ سرمایہ کسی دقت کے بغیر فوراً مل گیا۔

قدرت بھی عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ نہ شوکت کو معلوم تھا کہ نورجہاں "سن رائز" میں آچکی ہے اور نورجہاں کو بھی پتہ نہ تھا کہ اس کا عدالتی مجازی شوکت بھی اس کا ہمراہی ہے۔ بڑی لمبی داستان ہے، میں اسے مختصر کرنا چاہتا ہوں۔

ایک دن یہ راز فاش ہو گیا۔ نظامی بہت گھبرایا کہ البیانہ ہو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ جو فلم شوکت کو ڈائرکٹ کرنا تھی، اسی کی ہیروئن نور جہاں مقرر کی گئی تھی۔ دونوں کا "پنر ملن" نظامی کے لئے بڑا اندوہناک ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ نور جہاں کے والی کی حیثیت سے اس نے سیٹھ ویاس سے کہا کہ وہ ہرگز ہرگز اس قسم کا سلسلہ برداشت نہیں کریگا۔ مگر سیٹھ دیاس نظامی سے کچھ زیادہ ہی کائیاں نکلا کہ اس نے اپنی گجراتی حکمتِ عملی سے جو پنجابی حکمتِ عمل کے معاملے میں بڑی گہری اور دھانسو قسم کی ہوتی ہے، نظامی کو ہموار کر دیا وہ راضی ہو گیا کہ نورجہاں شوکت کی پکچر میں کام کریگی اور ضرور کرے گی، چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے۔ چنانچہ وہیں دفتر میں دونوں نے ایک دوسرے سے معانقہ کیا۔ اللہ ملائے اور ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔

اب دونوں اپنی اپنی جگہ پر خوش تھے۔ سیٹھ ویاس اس لئے کہ اس نے اپنا الّو سیدھا کر لیا تھا، اور نظامی اس لئے کہ اس نے ایک فلمی سیٹھ کی خوشنودی حاصل کر لی اور اس کو زیرِ احسان کر لیا تھا۔ سیٹھ ویاس کڑ قسم کا ویشنو تھا۔ ورنہ وہ اسے اسی رات گھر بلا کر ممتاز شانتی کے ہاتھ کے پکے ہوئے مرغ اور پلاؤ سے اپنی اس کی دوستی ضرور مستحکم کرتا اور اگر سیٹھ تبدیل کا رسیا ہوتا تو وہ اپنے مربی مینجر کے

ذریعہ سے دو مدد سرکاری بلیک مارکیٹ سے ضرور منگواتا۔

بہرحال بات پکی ہو گئی۔ کیونکہ نظامی بیسنے پر ہاتھ رکھ کر سیٹھ دیاس سے کہہ چکا تھا کہ سیٹھ، اب کہ تم نے مجھے بھائی کہہ دیا، میں تم کو وچن دیتا ہوں کہ مینہ یا آندھی ـــ طوفان بھی ہو ـــ تمہاری شوٹنگ ہوگی تو بے بی نورجہاں وقت پر پہنچے گی۔

اب ایک لطیفہ سنیئے۔ بات تو خیر پکی ہو گئی تھی۔ میرا بھی سیٹھ دیاس سے ایک کہانی کے لئے کنٹریکٹ ہو گیا تھا۔ میں اور شوکت چنانچہ اس کا موضوع تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ "پیشگیاں" مل چکی تھیں۔ اس لئے ناسک کی ہرن مارکہ وسکی کی فراوانی تھی۔ دور پر دور چلتے تھے۔ مرزا مشرف چاولہ اور سہگل (یہ دونوں حضرات اب بڑے ڈائرکٹر بن چکے تھے) ہماری اردلی میں ہوتے تھے۔ ذرا وسکی ختم ہوئی اور چاولہ بھاگے ناگپاڑے۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہوئی تو مرزا مشرف حاضر تھے۔

لطیفے میں سے لطیفہ نکلتا ہے۔ مرزا مشرف ہمارے ساتھ پیتے تھے، لیکن عجیب بات ہے کہ تیسرے پگ کے بعد رونا شروع کر دیتے۔ زاروقطار روتے تھے۔ شوکت کے ہاتھ پاؤں چومتے اور وہ شکوک جو شوکت کے دل میں ان کے بارے میں کبھی گزرے بھی نہیں تھے ان کا ذکر کرتے اور کہتے کہ وہ سب غلط ہیں۔ اس کے بعد وہ رو رو کر اپنی

نئی بیاہتا بیوی کو یاد کرنے لگتے - اور پھر گانا سُنانا شروع کر دیتے تھے ۔۔۔۔ یہ سب فراڈ یعنی جعل تھا مگر فلمی دُنیا میں اس کے سوا اور ہوتا بھی کیا ہے ۔

اب میں اصل لطیفے کی طرف آتا ہوں کہ وہ اس مضمون کا سب سے دلچسپ حصّہ ہے ۔

سیٹھ دیاس اپنے فلم کی شوٹنگ شروع کر چکا تھا۔ جو سین فلمائے گئے تھے ان میں نورجہاں نہیں تھی ۔ یعنی دوسرے الفاظ میں شوکت اور نورجہاں کی ابھی تک صحیح معنوں میں ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک رات نوٹس بورڈ پہ یہ اعلان چسپاں ہو گیا کہ نورجہاں سیٹ پہ آرہی ہے ماس کر باضابطہ طور پر کمپنی کی طرف سے مطلع کر دیا گیا تھا۔

اسی رات کو میں گھومتا گھامتا شیواجی پارک میں رفیق غزنوی کے پاس چلا گیا۔ اس مشہور نغمہ ساز اور موسیقار کے پاس جس کی مختلف ٹائیوں کی گرہوں میں مختلف قسم کے ارمان بندھے ہیں۔

رفیق غزنوی میرا دوست ہے ۔میرے اس کے بڑے ہی بے تکلف مراسم ہیں ۔میں اس کے فلیٹ پر پہنچا تو محفل جمی ہوئی تھی۔ میں بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اُس کی صوفے پر تازہ ترین بیوی خورشید عرف "انورادھا" بیٹھی ہے اس کے ساتھ نورجہاں ہیں۔ ایک کرسی

پر شری نظامی جی براجمان ہیں اور فرش پہ چاے رفیق غزنوی صاحب یوں بیٹھے ہیں۔ جیسے کسی سومنات پر حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔

رفیق غزنوی کے متعلق میں چند سطروں یا چند صفحات میں کچھ لکھ نہیں سکتا۔ اس کا تشخص اور کردار اتنا وسیع ہے کہ اس پر اگر کوئی ضخیم کتاب نہیں تو ایک طویل مضمون ضرور ہونا چاہیئے۔ میں اپنے قارئین سے وعدہ کرتا ہوں کہ یہ قرض میں ایک نہ ایک دن ضرور چکا دوں گا۔

رفیق میرا دوست ہے۔ میں اگر کل کلاں موت کی آغوش میں چلا گیا اور وہ بھی کچھ دیر بعد میری طرح قبر کی آغوش میں چلا گیا۔ تو حقِ رفاقت کون ادا کرے گا۔ کون اتنے بڑے موسیقار، اتنے دلچسپ کردار کی داستانِ حیات بیان کرے گا۔ انشاءاللہ میں کروں گا مگر وقت آنے پر۔

خیر یہ جملہ معترضہ تھا — رفیق — سومنات پر اپنے تازہ ترین حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ نظامی اس سے غافل تھا یا نہیں، یا نور جہاں کو اس کے ارادوں کا علم تھا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

مجھے نظامی سے اتنا معلوم ہوا تھا کہ ممتاز شانتی ابھی آنے والی ہے۔ میں حیران تھا کہ ادھر شوٹنگ ہونے والی ہے ادھر جام کے دور چل رہے ہیں۔ نظامی کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ نور جہاں بھی ہولے ہولے خوش رنگ مشروب اپنے ہونٹوں کے ذریعہ سے چوس رہی تھی۔ خورشید عرف نورادھا

تو تجربہ کار شرابیوں کی طرح گھونٹ بھرتی تھی۔ اور رفیق ——— غزنہ کا رفیق۔ اس غزنہ کا جس نے محمود پیدا کیا تھا اور جو ایک ایاز کی محبت میں گرفتار تھا۔ گلاس قالین پر رکھے میراثیوں کے لطیفے سنا رہا تھا۔

میں جب اندر داخل ہوا تو اس نے حسبِ عادت استقبال کے طور پر ایک بھاری بھرکم گالی اپنے منہ سے اگلی۔ لیکن پھر فوراً شریفانہ لب و لہجہ اختیار کرکے مجھ سے کہا: "آئیے آئیے تشریف رکھیے"۔ نورجہاں کی طرف دیکھ کر اس نے مجھ سے کہا: "جانتے ہو ان کو؟"

میں نے جواب دیا: "جانتا ہوں"

رفیق چار پگ پینے کے بعد عام طور پر شرابی ہو جاتا ہے۔ لکنت بھرے لہجہ میں اس نے مجھ سے کہا: "نہیں تم کچھ نہیں جانتے منٹو ——— یہ نور ہے ——— نورِ جہاں ہے ——— سرورِ جاں ہے۔ خدا کی قسم ایسی آواز پائی ہے کہ بہشت میں خوش الحان سے خوش الحان حور بھی سنے تو اسے سیندور کھانے کے لئے زمین پر اتر آئے"

میں جانتا تھا وہ تعریف کے یہ پُل کیوں باندھ رہا ہے۔ دراصل ان پُلوں کے ذریعے ہی سے وہ نورجہاں کے جسم تک پہنچنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ نورجہاں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ رفیق کی یہ باتیں سنتی تھی اور اس کو خوش کرنے کے لئے ایک مصنوعی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں

پر پیدا کر لیتی تھی۔

رفیق اوّل درجے کا کنجوس ہے۔ مگر اس دن اس نے غیر معمولی فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ بوتل میں سے میرے لئے ایک بہت بڑا پگ عنایت کیا اور اصرار کیا کہ میں اسے ایک ہی جرّعے میں ختم کر دوں" تاکہ ایک دوسرا بھی رہے۔

سب پی رہے تھے۔ نورجہاں کا پگ بہت ہلکا تھا جسے وہ آہستہ آہستہ ہونٹوں کے ذریعے سے چوس رہی تھی۔ جیسے مکھیاں پھولوں سے ہولے ہولے شہد چوستی ہیں۔

رفیق، نورجہاں کی تعریف و توصیف کے مزید پل باندھ رہا تھا، کیونکہ پہلے پل سب ٹوٹ گئے تھے، کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

خورشید عرف انورادھا نے اپنے دُبلے پتلے مگر خوبصورت ہاتھ سے ٹیلی فون کا چونگا اُٹھایا اور کان کے ذریعے سے دوسری طرف کی آواز سُنی اور سٹپٹا سی گئی۔ فوراً چونگے کا منہ بند کرکے نورجہاں سے مخاطب ہوئی "سیٹھ وِیاس ہیں"

نظامی نے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہ کیا اور کہا "بیٹا کہہ دو کہ نورجہاں یہاں نہیں ہے۔"

خورشید عرف انورادھا نے سیٹھ ویاس سے مناسب و موزوں الفاظ

میں کہہ دیا کہ وہ یہاں نہیں ہے ۔"

جب یہ ٹیلی فون کا سلسلہ ختم ہوا ۔ تو رفیق نے خورشید سے کہا ۔ "شیداں ۔۔۔۔ جاؤ ، اندر سے ہارمونیم لاؤ ۔۔۔ سیٹھ ویاس جائے جہنم میں ۔"

شیداں اندر گئی اور ہارمونیم کی پیٹی لے آئی ۔ رفیق نے اس کو کھولا ، اس کا ڈھکنا اُٹھایا اور ہوا بھر کے اپنے مخصوص انداز میں ایک سُر چھیڑا اور خود ہی جھومنے لگا ۔ "ہائے ۔۔۔۔ سبحان اللہ ۔۔۔ واہ ۔" دیر تک وہ باجے کے مختلف سروں کو چھیڑ کر "ہائے سبحان اللہ" اور "واہ واہ" کرتا رہا ۔۔۔۔ میرا خیال ہے رفیق پر علامہ اقبال کا یہ مصرع صادق آتا ہے ۔

دیتے ہیں سرورِ اوّل ، لاتے ہیں شراب آخر

گانے سے پہلے ہی رفیق سامعین پر وجد طاری کر دینے کا عادی ہے مگر اس دن وہ نہ گا پایا ، اس لئے کہ اس کی ساری توجہ نورجہاں پر مرکوز تھی ۔ ایک سُر چھیڑ کر اس نے نورجہاں کی طرف اپنی مخمور آنکھوں سے دیکھا اور درخواست کی "نور ۔۔۔۔ بس ہو جائے کوئی چیز ۔۔۔ ہائے کتنا پیارا اور مدھر سُر ہے ۔۔۔ چلو گاؤ ۔"

آپ پڑھے پڑھے ایکٹر ایکٹرسوں کے ڈرامے دیکھتے ہیں اور ان کی

کردار نگاری سے متاثر ہوتے ہیں -- میں آپ کو اس ڈرامے کی ایک جھلک دکھاتا ہوں۔ جو اس روز وہاں کھیلا گیا --- جیتے جاگتے، سو فی صد حقیقی ڈرامے کی جھلک۔

نورجہاں نے ہارمونیم صوفے پر رکھ لیا۔ اس کے پاس خورشید عرف انورادھا وسکی کا گلاس ہاتھ میں لئے بیٹھی ہے۔ رفیق غزنوی قالین پر آلتی پالتی مارے نورجہاں کی طرف اپنی عشق پیشہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، اور گانا سننے سے پہلے ہی جھوم رہا ہے۔ دائیں ہاتھ کرسی پہ شری نظامی جی براجمان ہیں۔ ان کے ساتھ ہی نیاکسار ہے جو اپنا دوسرا پیگ پی رہا ہے۔

نورجہاں گانا شروع کرتی ہے۔ غالباً پیلو کی ٹھمری ہے ---

تورے نین کا جر بن کارے

کہ ایک موٹر ہوٹے سے پورچ میں رکتی ہے۔ ایک صاحب اس کے اندر سے نکلتے ہیں اور سیدھے اندر چلے آتے ہیں ----- یہ سیٹھ ویاس ہیں۔

ایک لحظہ کے لئے سب بوکھلا جاتے ہیں۔ مگر نظامی فوراً ہی حالات پر قابو پا لیتا ہے۔ سیٹھ ویاس کی آمد سے گویا بے خبر وہ چلّا کر خورشید سے کہتا ہے: "بیٹا یہ کیا ظلم کر رہی ہو تم ---- اسے اتنی تکلیف

اور تم اُسے گانے پر مجبور کر رہی ہو ـــــ دیکھا ایک بول گانے کے بعد اس کا کیا حال ہو گیا ہے :" پھر وہ نور جہاں سے تشویش بھری آواز میں کہتا ہے :" لیٹ جاؤ نُور جہاں ۔ لیٹ جاؤ " اور وہ آگے بڑھ کے اُسے لِٹا دیتا ہے ۔ نُور جہاں زور زور سے کراہنا شروع کر دیتی ہے ۔ رفیق بھی اُٹھ کر انتہائی تشویش کا اظہار کرتا ہے۔ نظامی خود شیدو سے مخاطب ہوتا ہے ، کسی قدر تیز لہجے میں کہتا ہے " شیداں اُٹھ بیٹھ کیا سوچ رہی ہے ۔ جا جلدی سے گرم پانی کی بوتل لا۔ بڑے زور کا دورہ پڑا ہے :"

شیداں اُٹھ کر تیز قدمی سے اندر چلی جاتی ہے ۔ نظامی کراہتی ہوئی نور جہاں کو پچکارتا ہے ، پھر سیٹھ ویاس سے مخاطب ہوتا ہے ۔
" بھائی جان ـــــ وہ ـــــ وہ تکلیف ہے ـــ وہی جو اکثر اول کو ہوا کرتی ہے :"

سیٹھ ویاس خاموش رہتا ہے ۔ میں بھی دم بخود ہوں ۔
نظامی ایک بار پھر کراہتی ہوئی ، دوہری ہوتی ہوئی نور جہاں کو پچکارتا ہے اور سیٹھ ویاس کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے ۔
کل سے عجیب درد کے مارے پیچ و تاب کھا رہی ہے ـــــ مجھ سے کہتی تھی چچا جان ! مجھ سے شوٹنگ نہ ہو سکے گی ۔ پر میں نے کہا

نہیں بیٹا! یہ بڑا شگون ہے۔ یہاں ممبئی میں یہ تمہاری پہلی پکچر ہے اور پھر شوٹنگ کا پہلا دن ——— یہ بھی چھوڑو۔ سیٹھ دیاس مجھے اپنا بھائی کہہ چکا ہے ——— تم مرجاؤ مگر ضرور جاؤ ——— چنانچہ ہم اسی لئے یہاں آئے تھے کہ رفیق سے تھوڑی سی برانڈی لیں اور اس کی کار لے کر اسٹوڈیو پہنچ جائیں۔ آپ کچھ فکر نہ کریں۔ آپ کا نقصان میرا نقصان ہے ——— نورجہاں ابھی پہنچتی ہے ——— آپ میرے بھائی ہیں۔"

سیٹھ دیاس خاموش رہا ——— نظامی کے سوا اور سب خاموش تھے۔ رفیق غزنوی دانتوں سے اپنے ناخن کاٹ رہا تھا۔ میں گلاس ہاتھ میں لئے سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟

کہانی میری تھی۔ میوزک رفیق غزنوی دے رہا تھا ——— اور سیٹھ دیاس، ہمارا آقا، عین موقعہ پر پہنچ گیا تھا۔ جبکہ ہم رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ رنگ رلیاں ہی تو تھیں اور کیا تھا۔ وسکی کا دور چل رہا تھا اور نورجہاں گا رہی تھی ———

تورے نین کا جرین کارے

اچھا خاصا مجرا ہو رہا تھا۔

نظامی نے سیٹھ دیاس سے اپنے مخصوص انداز میں کچھ اور باتیں

گیں اور اسے یقین دلایا کہ جب دونوں ایک دوسرے کو بھائی کہہ چکے ہیں تو دلوں میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے۔

اتنے میں خورشید گرم پانی کی بوتل لے کر آگئی جو نورجہاں کے پیٹ پر رکھ دی گئی۔ اس سے اس کو کچھ سکون ہوا۔ اس پر نظامی نے سیٹھ دیاس سے جو ابوالہول بنا بیٹھا تھا کہا " آپ تشریف لے چلئے ہیں اور رفیق نورجہاں کو ساتھ لے کر ابھی آتے ہیں " پھر اس نے اپنے آپ سے کہا " میرا خیال ہے خورشید بھی ساتھ چلے۔ عورتیں عورتوں کے سب معاملات جانتی ہیں۔"

سیٹھ دیاس اٹھا اور اپنی ٹوپی ٹھیک کرتا چلا گیا ــــ سب کی جان میں جان آئی۔ نورجہاں نے اپنے پیٹ سے گرم پانی کی بوتل الگ کی جو ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی تھی اور نظامی سے کہا " نظامی چچا۔ آپ نے تو کہا تھا، مت جانا۔"

نظامی سنجیدہ ہو گیا ــــ " بیٹا، وہ میں نے تمہارے بھلے ہی کے لیے کہا تھا۔ پہلے ہی دن آدمی شوٹنگ پر چلا جائے اور پروڈیوسر کو پھیرے نہ کرائے تو وہ سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ اپنی ممتاز سے پوچھو۔ جب تک اسٹوڈیو سے گاڑی نہ آئے۔ مجال ہے جو وہ شوٹنگ میں جائے اور پھر جب گاڑی بھی آتی ہے تو میں اسے کم از کم ایک گھنٹہ

میچے کھڑی رکھتا ہوں ـــ رائے بہادر چونی لال میرے اتنے دوست ہیں ـ مگر میں ان کی بھی کوئی پروا نہیں کرتا ـــ بعض دفعہ تو ایسا بھی ہُوا کہ وہ خود اپنی گاڑی میں ممتاز کو لینے آئے ـــ بہرحال اب سب ٹھیک ہے ـ خود آیا ہے یہاں چل کر اور پھر تم بیمار ہو اور بیماری کی حالت میں جا رہی ہو ـــ سیٹھ دیا ہں کہ اس کا خیال رہے گا۔"

نظامی نے کچھ دیر اور پروڈیوسر اور آرٹسٹ کے باہمی "رشتے" کی بار یکیاں بیان کیں اور وہ تمام گر بتائے جو آرٹسٹ کو استعمال کرنے چاہئیں ـ اس کے بعد گفتگو آہستہ آہستہ شوکت حسین رضوی میں تحلیل ہو گئی ـ نظامی اپنی باتوں سے زبردستی نورجہاں کے دل و دماغ میں یہ خیال ٹھونسنا چاہتا، کہ اب اُس کو اُس شخص سے کوئی سروکار نہیں ـ اس کے دل میں اب اس کے لئے کوئی جگہ نہیں اور یہ کہ اسے وہی راستہ اختیار کرنا چاہیئے، جس پر ممتاز شانتی اُس کی ہدایات کے مطابق اتنے برسے سے چل رہی ہے ـ اور اتنا نام اور روپیہ پیدا کر چکی ہے۔

اس گفتگو میں مجھے بھی حصّہ لینا پڑا کہ شوکت سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی اور وہ اس بات کا اقبال بھی کر چکا تھا کہ اسے نورجہاں سے محبت ہے ـ اور مرنا مشرق سے جو اس کا سلسلہ جاری تھا اس

سے تو قطعی طور پہ یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ دوسری عورتوں کی آغوش میں
نور جہاں کی یاد کو دفن کرنا چاہتا ہے، اور ہرن مارک جیسی تھرڈ کلاس لڑکی
سے اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اصلاً شوکت گھڑی ساز تھا اور اپنے فن میں مہارتِ تامہ رکھتا
تھا۔ اس لئے وہ ہر شے کی نوک پلک درست کرتا رہتا تھا۔ اسکی طبیعت
کسی اُکھڑے ہوئے پرزے، کسی ٹیڑھی کیل، کسی غلط وقت دینے والی
گھڑی، کپڑے میں کسی شکن اور سلوٹ کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اس
کی جبلّت میں ایک نظم ہے، وہی نظم جو ایک اچھی گھڑی میں ہوتا ہے اگر
یہاں نور جہاں کے معاملے میں وہ خود کو بے بس سمجھتا ہے۔ وہ اس
گھڑی کے کل پرزے کیسے درست کر سکتا تھا، جس کو دل کہتے ہیں۔ اگر
یہ کوئی ایسی چیز ہوتی، جسے وہ اپنے سامنے رکھ کر محدب شیشے میں دیکھ
سکتے۔ اس کی بال کمانی اور اس کی گراریوں کا مطالعہ کر سکتا۔ تو یقیناً
وہ پیچ کش لے کر انھیں سب کا سب کھول دیتا، جو گڑبڑ پیدا ہونے کا
موجب ہو رہی تھیں۔ مگر یہ معاملہ دل کا تھا۔

اُدھر نور جہاں بھی جو اپنے گلے سے باریک باریک سُر نکال سکتی
تھی، حیران تھی کہ اپنے دل سے شوکت کی یاد کیسے نکالے۔ وہ خیال بڑے
بڑے اُستادوں کی طرح گا سکتی تھی۔ مگر ایک خیال اس کے دل و دماغ

پر ہر وقت چھایا رہتا تھا۔ اور یہ خیال اس کے محبوب کا تھا۔ بانکے چھبیلے شوکت کا جس نے اس کو زندگی کی بہترین لذت بخشی تھی۔ جس نے اس کے بدن میں وہ حرارت پیدا کی تھی۔ جو موسیقی جیسی لطیف چیز بھی پیدا نہیں کر سکتی۔۔۔ وہ اسے کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ جو اس کے جسم میں ایک عرصے تک ڈبکیاں لگاتا رہا تھا۔

شوکت کے متعلق گفتگو شروع ہوئی اور نور جہاں نے اوپرے دل سے اس کے متعلق اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اس سے کہا ۔۔۔ نور جہاں یہ سب بکواس ہے۔ جو کچھ تم نے کہا ہے خدا کی قسم تمہارے دل سے نہیں نکلا اور جو کچھ میں اس خرذات شوکت سے سنتا ہوں۔ خدا کی قسم وہ بھی قطعاً جھوٹ ہوتا ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے پر مرتے ہو۔ مگر دونوں خود فریب ہو ۔۔۔ ابھی کل مسعود کے دفتر میں تمہاری باتیں ہو رہی تھیں ۔۔۔ کل شام کیا، ہر شام جب میں اور شوکت پینا شروع کرتے ہیں۔ تو وہ کسی نہ کسی حیلے تمہاری بات چھیڑ دیتا ہے۔ پھر خود ہی کہتا ہے کہ اس کی بات نہ کرو یہی حال تمہارا ہے۔ میں نے تمہاری یاد میں اس کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے ہیں اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ اگر وہ تم سے دور رہا۔ تو وہ اپنی جوانی، اپنی صحت تباہ کرے گا۔ وہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ معلوم نہیں تم نے اس پر کیا

جادو پھونک رکھا ہے؟"

نورجہاں پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

میں نے پھر کہنا شروع کیا: "نورجہاں خود فریبی سے کام نہ لو۔ میں مانتا ہوں کہ نظامی صاحب بڑے جہاندیدہ آدمی ہیں، لیکن عشق و محبت میں وہ گر کبھی نہیں چلتے۔ جو زندگی کے دوسرے بازاروں میں چلتے ہیں۔ یہ کھوٹے سکے ہیں" ——— میں ایک دم نظامی صاحب سے مخاطب ہوا "کیوں نظامی صاحب۔ کیا یہ جھوٹ ہے؟"

نظامی صاحب کچھ ایسے میری تقریر میں گم تھے کہ انھوں نے جب نفی میں اپنا سر ہلایا۔ تو انھیں مطلق اس کا احساس نہیں تھا۔ پھر جب ایک دھچکے کے ساتھ انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو تیر بہت آگے نکل چکا تھا۔ میں نورجہاں سے جس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے کہہ رہا تھا: "تم دونوں بیوقوف ہو، ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو، مگر اسے چھپائے پھرتے ہو ——— کس سے ——— کن سے ——— یہ دنیا تو معاف کرنا نورجہاں کسی کو بھی محبت کرتے نہیں دیکھ سکتی ——— لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ لوگ محبت کرنا چھوڑ دیں۔ تمہارا نشانی کی زندگی واقعی قابلِ رشک ہے۔ نظامی صاحب جیسے شفیق اور ہوشیار چچا کی سرپرستی میں وہ یقیناً خدا کے فضل و کرم سے اور بھی ترقی کرے گی۔

"لیکن ـــــــ" یہاں میں پھر نظامی سے مخاطب ہوا: "لیکن نظامی صاحب
آپ سے یہ مخفی نہیں ہوگا کہ ہر آدمی کے لئے ایک ہی چیز کام نہیں دے
سکتا۔ آپ نے جو ہدایات ممتاز کے لئے سوچی تھیں، ظاہر ہے کہ وہ
نورجہاں کے لئے کارآمد ثابت نہیں ہوسکتیں۔ دونوں کے مزاج میں
زمین آسمان کا فرق ہے ــــ۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟"

میں اب نظامی کو اس مقام پر لے آیا تھا۔ جہاں وہ میری کوئی بات جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ میں نے موقعہ غنیمت سمجھا اور بولتا چلا گیا۔ میں نے نورجہاں کے دل و دماغ پر جو اس کے لئے غالباً پہلے ہی سے تیار تھا یہ حقیقت اچھی طرح مرتسم کر دی کہ وہ اور شوکت ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں اور یہ جو وہ خود فریبی سے کام لے رہے ہیں، بڑی بھیانک چیز ہے۔

نظامی جب اُٹھا تو وہ کوئی خوش آدمی نہیں تھا۔ (اس جملے میں انگریزی پن ہے مگر یہ مجھے پسند ہے) مگر اپنی فطرت سے مجبور وہ مجھ روکھے پن کا اظہار نہ کرسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے نورجہاں سے یہ کہہ کر کہ وہ ٹھنڈی بوتل کی بجائے گرم بوتل لے کر خورشید کے ساتھ اسٹڈیو چلی جائے اور وہاں وقتاً فوقتاً درد کا بہانہ کرتی رہے۔ تو اس نے بڑی خندہ پیشانی سے مجھ سے گفتگو کی اور مجھے یقین دلایا کہ میرے لئے فلیٹ اور فرنیچر وغیرہ کا مکمل بندوبست کر رکھا ہے۔ اس کو حیرت تھی کہ میں اتنے دنوں

کہاں غائب رہا۔ فلیٹ کی چابی اس کے بنجر کے پاس تھی اور وہ میرا منتظر تھا۔ بلیک مارکیٹ سے پٹرول حاصل کرنے کے لئے بھی انھوں نے ویسا ہی مکمل انتظام کر چھوڑا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی دلی خواہش تھی کہ میں ان کی دعوت قبول کر دوں جس میں وہ میری تواضع علاوہ مرغوں کے "جونی واکر بلیک لیبل" سے کریں گے۔

میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا، لیکن وہ مصر تھا کہ میں ضرور اس کی دعوت قبول کر دوں۔ چنانچہ میں نے قبول کر لی۔ مگر مجھے یقین تھا کہ اگر میں اس کے ہاں چلا بھی گیا تو مرغ اور جونی واکر بلیک لیبل کا ذکر تک بھی نہیں ہو گا۔

خیر —— ! نظامی صاحب کو چھوڑیئے کہ وہ نظامی صاحب ہیں —— معلوم نہیں کس رعایت سے۔ ممکن ہے حسن نظامی دہلوی کے مرید ہوں یا خود ساختہ نظامی ہوں۔ مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ میری اس شام کی تقریب نا گفتگو نے نظامی کے تمام پلان درہم برہم کر دیئے۔

مجھے معلوم ہوا کہ نور جہاں اب کمال امروہی سے کوئی دلچسپی نہیں لیتی۔ اس کے ٹیلی فون آتے ہیں۔ مگر وہ کوئی جواب نہیں دیتی۔ وہ اپنی سیکنڈ ہینڈ کار لے کر آتا ہے مگر وہ کسی کمرے میں چھپ جاتی ہے اور نظامی کی ہدایات کے مطابق عمل نہیں کرتی۔

ان تمام باتوں کی رپورٹ میرے ذریعے سے شوکت تک پہنچ جاتی تھی۔ ہمیں اس بات کا کامل احساس تھا کہ وہ مرد تسمہ پا نظامی کے شکنجے میں ہے اور اس کا وہاں سے نکلنا مشکل ہے۔ چنانچہ ہم نے ایک کانفرنس کی۔ جس میں نذیر لدھیانوی ایڈیٹر مصوّر دہلی میں اور شوکت شامل تھے۔ طے ہوا کہ وہیں کیڈل روڈ پہ کوئی مکان حاصل کیا جائے۔

نذیر لدھیانوی کی کوششوں سے کیڈل روڈ پر ساحل سمندر کے بالکل قریب گراؤنڈ فلور پہ ایک نہایت عمدہ فلیٹ مل گیا، جس میں تین غسل خانے تھے۔ بڑے کمرے تھے اور ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم تھا۔

نذیر نے جو کہ ۱۷ اڈلفی چیمبرز جیسے واہیات فلیٹ میں رہتے رہتے اُکتا گیا تھا، شوکت سے کہا کہ وہ شرکت کرنے کے لیے تیار ہے۔ دونوں اکٹھے رہیں گے۔ چنانچہ فوراً فلیٹ حاصل کر لیا گیا۔ کرایہ غالباً ایک سو پچہتر روپے یا دو سو روپے ماہوار تھا۔ فرنیچر اور دوسرے ساز و سامان سے چند دن کے اندر اندر یہ جہازی فلیٹ سجا دیا گیا۔ شوکت کا بیڈ روم سمندر کی طرف تھا۔

ادھر سے اگر پانچ سو قدم کا فاصلہ طے کیا جاتا تو نظامی کا فلیٹ آ جاتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اب نورجہاں اور شوکت میں صرف اتنے ہی

قدموں کا فاصلہ باقی رہ گیا تھا۔

میرے ذمّے جو کام تفویض کیا گیا تھا، وہ میں خوش اسلوبی سے نبھا رہا تھا۔ کبھی کبھی نظامی کے ہاں جا نکلتا تھا، اور اگر نور جہاں موجود ہوتی تھی تو اس کو بتا دیتا تھا کہ شوکت نے کتنی آہیں اس کے لئے بھری ہیں اور رات کو پینے کے بعد وہ کتنی مرتبہ اس کے فراق میں رویا ہے۔

نور جہاں کو میرے ذریعے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ شوکت اس کے پڑوس میں مقیم ہے اور یہ کہ صرف پانچ سو قدم ساحل کے ساتھ چل کر وہ اس کے پاس پہنچ سکتی ہے، یا وہ اس کے پاس —— سبھی کی بیمار ہے اور دیدار یار بھی۔

میں نے کئی دفعہ محسوس کیا کہ یہ کام جو میں کر رہا ہوں کبھی بڑی کٹھن کا ہے۔ مگر دوست کے لئے آدمی کیا کچھ نہیں کرتا؟

یہاں میں آپ پر واضح کر دوں کہ میں دونوں کی شادی کے سخت خلاف تھا۔ ایکٹرس سے شادی کا سلسلہ ہی میرے نزدیک بڑی غلط بات ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہیں، بس ٹھیک ہے، جب اُکتا جائیں اپنا اپنا راستہ پکڑیں۔ مگر شوکت پر ٹھکوانے کا قائل تھا کہ زمین ساری عمر اسی کی ملکیت رہے، میں نے اسے بہت سمجھایا، وہ مان گیا۔ کہ اگر نور جہاں سے اس کا ملاپ ہو گیا تو وہ شادی نہیں

کرے گا۔

مجھے جو کرنا تھا، کر چکا تھا۔ میں اب اپنی کہانی کا جس کا عنوان "ذکر" تجویز ہوا تھا، منظرنامہ لکھنے میں بے طرح مصروف تھا۔ اس کے علاوہ کیڈل روڈ اور بائی کلہ میں کئی میل حائل تھے، اس لئے شوکت کے ہاں میرا آنا جانا کم ہو گیا۔

ان دنوں اچھی بیئر نایاب تھی۔ اتفاق سے امریکی بیئر کی چار فربہ اندام بوتلیں مجھے مل گئیں۔ میں یہ سانڈ لے کر کیڈل روڈ پہنچا۔ صبح کا وقت تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ مشروب ناشتے ہی سے شروع کیا جائے۔

جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ فلیٹ سنسان ہے۔ نذیر لدھیانوی نہا دھو کر اور ناشتہ کر کے دفتر روانہ ہو چکا ہے، اور شوکت سو رہا ہے۔

میں اس کی خواب گاہ کے پاس پہنچا اور دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ پھر ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے شوکت کی خواب آلود آواز آئی ——— "کون ہے؟"

میں نے جواب دیا "منٹو"

"شوکت نے کہا "ٹھہرو!"

میں ٹھہرا رہا تھا۔ تین منٹ کے بعد دروازہ کھلا۔ کمرے کے اکلوتے

پلنگ پر نورجہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔
—"انقلاب زندہ باد!"
نورجہاں کی آنکھیں ایسا معلوم ہوتا تھا ابھی ابھی لانڈری سے دُھل کے آئی ہیں۔ میں نے شوکت کو دیکھا کہ وہ کسی قدر مضمحل تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "تو چتوڑ گڑھ فتح ہو گیا۔"
شوکت مسکرا دیا۔ اس کی یہ مسکراہٹ اطمینان بھری تھی کہنے لگا۔
"آؤ بیٹھو۔"
میں اُن کے پلنگ کے پاس ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر بیٹھ گیا اور شوکت سے مخاطب ہُوا "کیوں بھئی، یہ محترمہ کیسے تشریف لائیں؟"
شوکت نے فاتحانہ نظروں سے نورجہاں کو دیکھا جو پلنگ پر چادر سے خود کو اچھی طرح ڈھانپ رہی تھی "بس کچے دھاگے سے بندھی آئی ہیں۔"
معلوم نہیں وہ کچے دھاگے سے بندھی آئی تھی یا پکے دھاگے سے بندھی آئی تھی۔ پر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ دھاگا جیسا بھی تھا اس کی تخلیق ہاتھوں سے نہیں، دلوں سے ہوئی تھی۔ بڑے عمدہ طریقے پر بٹا ہُوا تھا، ورنہ وہ پانچ سو قدموں کا فاصلہ اتنی جلدی اور اتنی خوبی سے پاٹا نہ جا سکتا۔

قصہ مختصر یہ کہ شوکت بیڈ روم میں جس زنجیر کی کمی تھی وہ پوری ہو گئی تھی۔ اب وہ مکمل طور پر سج گیا تھا۔ لیکن ادھر نظامی فلیٹ میں ایک بتی بجھ گئی تھی۔ وہ بتی جو ایکسپلوڑ سے مکمل گھر میں تبدیل ہو سکتی تھی۔

نظامی نے اُسے بہت سمجھایا بجھایا، بھائیوں نے اسے بہت دھمکیاں دیں، پر جب عشق کا بھوت سر پہ سوار ہو تو کانوں کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ دھمکیاں اور بھبکیاں، پند و نصائح قطعاً اثر انداز نہیں ہوتے۔

شوکت نے مجھ سے کہا: "منٹو، میرا خیال ہے میں سالی سے شادی کر لوں۔"

میں نے پھر اُس سے کہا: "یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم اس کے مالک ہو، لیکن میری ایماندارانہ رائے یہی ہے کہ تمہارا یہ اقدام درست نہیں ہوگا۔ کیا تم نے اس بارے میں اپنے گھر والوں سے مشورہ کیا ہے؟"

اس سوال کا جواب شوکت گول کر گیا۔ بہرحال مجھے یقین تھا کہ وہ سوچ سمجھ کر قدم اُٹھائے گا اور عجلت سے کام نہ لے گا۔

بمبئی میں ایک بزرگ حکیم ابو محمد طاہر اشک عظیم آبادی کے نام سے تھے۔ یہ ایک عجیب شے ہے۔ عمر آپ کی پچھتر برس کے قریب تھی مگر دل جوان تھا۔ آنکھوں کی بینائی بالکل درست تھی۔ دانت سلامت تھے

ہر نئے فلم کا پہلا شو دیکھتے تھے۔ پانچ زبانیں بولتے تھے۔ اُردو، فارسی، عربی، انگریزی اور پنجابی۔ بڑے معر کے آدمی تھے۔ طبابت سے شغف تھا۔ شعر و شاعری سے بھی۔ شوکت سے میں نے ان کی ملاقات کرائی۔ تو وہ ان کے گرویدہ ہو گئے اور ان کو چچا جان کہنے لگے۔

حکیم صاحب نے ان سے دُور دراز کا کوئی رشتہ بھی پیدا کر لیا تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق وہ شوکت کے خاندان سے بہت پُرانے مراسم رکھتے تھے۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں، شوکت کے ہاں میرا آنا جانا بہت کم ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ بائی کلہ اور کیڈل روڈ میں فاصلہ کافی تھا۔ اس کے علاوہ میں کہانی کی منظر نویسی میں مشغول تھا۔ چند دن گذرے تو حکیم صاحب تشریف لائے۔ مجھے ان سے بڑی عقیدت تھی کہ میری زبان درست کرنے میں آپ نے غیر شعوری طور پر میری بہت مدد کی تھی۔ ان کو بھی مجھ سے محبت تھی کہ میں ان کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ باتوں باتوں میں آپ نے مجھے بتایا کہ شوکت بیٹے کا نکاح نورجہاں سے ہو گیا ہے۔ میں بہت حیران ہوا کہ مجھے اس کی خبر تک نہ ہوئی۔

جب میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تو حکیم صاحب نے سارا معاملہ گول

کرنے کی کوشش کی۔ جب ناکام رہے تو انھوں نے مجھ سے کہا: "دیکھو سعادت! یہ سب کچھ خفیہ طور پر ہوا ہے۔ تاکہ لوگوں میں چرچا نہ ہو۔ میں نے تم سے ذکر کر دیا کہ تم بھی شوکت کی طرح میرے بیٹے ہو، اس لئے یہ راز راز ہی رہے۔"

یہ راز کب تک راز رہ سکتا تھا؟ میں چھتّر برس کے بڈھے سے کیا بحث کرتا۔ مجھے غصہ صرف اس بات کا تھا کہ شوکت نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائے رکھی؟ اگر اسے نکاح کرنا ہی تھا تو میری شرکت اس میں کیوں ضروری نہ سمجھی۔ مجھے کیوں تاش کی گڈی میں سے جوکر سمجھ کر الگ کر دیا گیا ——— میرے دل میں تکدّر تھا، لیکن شوکت سے میں نے اس کا ذکر نہ کیا کہ اس سے میرے اس کے تعلقات یقیناً کشیدہ ہو جاتے۔

دن گذرتے گئے۔

نظامی تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ سیّد کمال حیدر امروہوی نے ہزاروں مرتبہ ٹیلی فون کیا، سینکڑوں مرتبہ اپنی سیکنڈ ہینڈ کار میں نظامی کے فلیٹ کے چکر کاٹے، آخر وہ بھی ناامید ہو کر دوسرے مشاغل میں مصروف ہو گیا۔

شوکت کا بیڈروم آباد تھا۔ وہاں ہنسی کے چھینٹے اُڑتے تھے۔ نورجہاں کے گلے سے نور برستا تھا۔ رفیق غزنوی سے جس قسم کی دھنیں

بنوائی ہوتی تھیں۔ ان کی ریہرسل ہوتی تھی۔ وہ جوتیاں کیڈل روڈ کے
اس فلیٹ میں مکمل کھیل رہی تھیں۔

میں آپ کو ایک لطیفہ سناؤں۔

میرے بھائی جان، سعید حسن بیرسٹر، جزائر فجی سے ایک مدّت کے
بعد امرتسر جانے کے لئے تشریف لائے۔ انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ
وہ بذریعہ ہوائی جہاز آرہے ہیں۔ اُن دنوں بمبئی میں رہتا تھا اور ہمارا
فلیٹ بہت ہی چھوٹا تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا۔ مصوّر کے
ایڈیٹر نذیر لدھیانوی بھی موجود تھے۔ طے یہ ہوا کہ ان کو اُس فلیٹ میں
ٹھہرایا جائے جہاں نذیر اور شوکت دونوں اکٹھے رہتے ہیں۔

یہ فلیٹ جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں بہت بڑا تھا۔ نذیر چھوٹا سا چپٹا سا ملک
تھا۔ شوکت تھا، اس کی نور جہاں تھی۔ اُن کو تو بس فقط ایک بیڈ روم چاہیے
تھا۔ باقی کمروں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے بھائی جان کیلئے
جو یورپی طرزِ رہائش کے عادی تھے۔ ایک علیحدہ کمرے اور غسل خانے کا
انتظام بڑی آسانی سے ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب وہ بمبئی تشریف لائے
اور چند روز کے لئے وہاں رُکے تو میں انھیں کیڈل روڈ پر لے گیا۔

وہ یہ فلیٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ عمارت قریب قریب نئی
تھی، جدید طرز کی۔ دو منزلہ تھی۔ اُوپر کی منزل میں صاحبِ مکان رہتے

تھے۔ پچھلی طرف یعنی جدھر سمندر کا ساحل تھا۔ کوئی دو سو قدم کے فاصلے
پہ ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ اس میں بچوں کے کھیلنے کے لئے جھولے تھے،
اور وہ جنھیں انگریزی میں "سی سا" کہتے ہیں اور وہ پھسلنے والے تختے۔

سمندر کی مرطوب ہوا ہر وقت آتی رہتی تھی بعض اوقات یہ اس قدر تیز ہو جاتی تھی کہ فلیٹ کے وہ تمام دروازے، وہ تمام کھڑکیاں جن کا رُخ سمندر کی طرف تھا۔ بند رکھنا پڑتی تھیں کہ چیزیں اپنی جگہ پر سلامت رہیں۔

اس فلیٹ میں بھائی جان اپنے مختصر سے اسباب کے ساتھ اُترے اور بہت خوش ہوئے۔ لیکن چند روز ہی میں ایک ٹریجیڈی وقوع پذیر ہو گئی۔

شوکت نور جہاں کو دوبارہ پا کر بہت خوش تھا۔ اس خوشی کا انعکاس کسی نہ کسی صورت میں نفسیاتی حد پر ہونا ہی چاہیئے تھا پھر مرزا شرف تھا۔ شوکت کی دیگ کا بہت بڑا چمچہ۔ چاولہ تھا، سہگل تھا اور دوسرے تھے جو شوکت کے ظلم میں شریک ہونے کے لئے بے قرار تھے۔

فلمی دُنیا اصل میں رات کی دُنیا ہے۔ دن بھر یہ سب اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے تھے اور سرِ شام شوکت کے یہاں جمع ہو جاتے تھے۔ وسکی کے دَور چلتے تھے۔ سوقیانہ قسم کے ہنسی ٹھٹھے ہوتے تھے۔ گھٹنے

گائے جاتے تھے۔ کہانیاں سنائی جاتی تھیں اور بعض اوقات اتنا شور برپا ہوتا تھا کہ اوپر کی منزل والوں کو پکار پکار کر کہنا پڑتا تھا کہ بابا خاموش رہو۔

ایک رات شوکت نے غالباً ایم اے مغنی کو جو پری چہرہ نسیم بانو کے ڈسنڈروچی کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اپنے ہاں مدعو کیا۔ مرزا اشرف بھی تھے، میں بھی تھا، میری بیوی بھی تھی۔ دعوتِ طعام سے فارغ ہو کر میں اور میری بیوی فوراً چلے گئے کہ ہمیں ایک ضروری کام سے کہیں جانا تھا۔ بھائی جان شوکت علی کے بیٹے زاہد کے ہاں مدعو تھے۔ وہ دیر سے لوٹے۔ مگر جب انھوں نے ہال میں قدم رکھا تو دیکھا کہ رندی در مستی پہ اپنے بال کھولے ناچ رہی ہے۔ وہ ہاؤ ہو ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ معلوم نہیں ہوا انھوں نے کیا دیکھا کہ صبح اٹھتے ہی اپنا سامان بندھوا کر خلافت ہاؤس چلے گئے اور مجھے اور میرے دوستوں کو اس قدر تیز و تند لہجے میں برا بھلا کہا کہ اب میں نے اس واقعہ کو یاد کیا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اتر رہا ہے۔

انھوں نے اصل میں اپنی ساری زندگی قانون کی کتابوں میں گزاری تھی۔ ساری عمر مقدمے لڑتے رہے تھے۔ لاہور میں، بمبئی میں، مشرقی افریقہ میں، جنوبی افریقہ میں۔ ان کو کیا معلوم کہ فلمی دنیا کیا ہوتی ہے؟ اور اس کے

عاشق اور معشوق کس قسم کے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پاؤں سر پہ رکھ کر بھاگ گئے اور خلافت ہاؤس میں جا کر پناہ لی۔ پُر لطف بات یہ ہے کہ یہ خلافت ہاؤس ایک ایسی گلی میں واقع ہے۔ جس کا نام "لولین" یعنی محبت کی گلی ہے۔

یہ قصہ تو خیر ضمناً آگیا کہ زیبِ داستان کے لئے کسی حد تک ضروری تھا۔ اب میں نورجہاں کی طرف لوٹتا ہوں جس کی بڑی بہن وہیں کیڈل روڈ پر پاس ہی اپنے بھائی کے ذریعہ سے پیشہ کراتی تھی۔ مگر پرائیویٹ طور پر مجھے معلوم نہیں یہ دونوں بہنیں آپس میں ملتی تھیں یا کہ نہیں۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں شوکت نے اس کی اجازت نورجہاں کو کبھی نہ دی ہو گی۔

نورجہاں کا بھائی پرلے درجے کا جواری تھا۔ سٹہ کھیلتا تھا تاش کے پتوں پہ داؤ لگاتا تھا۔ ریسوں میں جاتا تھا۔ اس کو ظاہر ہے کہ نورجہاں اور شوکت کا ملاپ سخت ناگوار گذرا تھا۔ جیسا کہ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں۔ اس نے چچا نظامی سے مل کر بہت کوشش کی کہ وہ پھر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور نورجہاں ان دونوں کی روزی کا ٹھیکہ بن جائے مگر یہ دال منڈھے نہ چڑھی۔ شوکت کو ہر قسم کی دھمکیاں دی گئیں۔ مگر وہ بھی ایک دبنگ

آدمی ہے۔ اس نے ان کی کوئی پروانہ کی اور نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ یہ محاذ بالکل خاموش ہو گیا۔

فلم "ذکر" کی شوٹنگ جاری تھی۔ رفیق اس کی موسیقی مرتب کر رہا تھا۔ بظاہر وہ اپنے کام میں پورے انہماک سے دلچسپی لیتا تھا، مگر میں صاف محسوس کر سکتا تھا کہ رفیق غزنوی ہر وقت اُلجھن سی محسوس کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی عین ناک کے نیچے (یہ بھی انگریزی محاورہ ہے) ایک اور شخص اُس لونڈیا کو اُڑا لے گیا تھا۔ جس پر اس کی عشق پیشہ آنکھ تھی۔

بہر حال فلم "ذکر" کی تکمیل اُفتاں و خیزاں جاری رہی۔ اس دوران میں مجھے معلوم ہُوا کہ شوکت فلم سازی کے معاملے میں بے حد متلوّن مزاج ہے۔ اس کو ایک آدمی کا کام پسند نہیں آتا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ وہ فقط ایک آدمی کے کام سے مطمئن نہیں ہوتا۔ میں نے اس کو کہانی کا مکمل منظر نامہ معہ مکالموں کے لکھ کر دے دیا تھا اور اُس نے پسند بھی کیا تھا۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ خفیہ طور سے کئی آدمیوں سے مکالمے لکھوا رہا ہے۔ ان میں ہمارے بزرگ اشک عظیم آبادی بھی تھے۔ مجھے بہت تاؤ آیا۔ جہاں تک اشک صاحب کا تعلق تھا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ مگر دوسروں کو میں قطعاً برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے چنانچہ بڑے گرم الفاظ میں شوکت سے اپنی شکایت کا اظہار کیا۔

آدمی سمجھدار ہے۔ حکمت عملی سے کام لے کر اس نے میرے دماغ پر برف کی کئی سلیں رکھ دیں۔ مگر میں دل برداشتہ ہو چکا تھا کیونکہ کہانی بھی میری مرضی کے مطابق نہیں لکھی گئی تھی اور اس کے ہر کردار اور ہر موڑ پر شوکت نے اپنی من مانی کی تھی۔

میں بڑا ہٹ دھرم اور ضدی آدمی ہوں، لیکن شوکت کے سامنے میری کوئی پیش نہ چلتی تھی، اس کے علاوہ میں نے چند دن اس کے ساتھ کام کر کے قطعی طور پر جان لیا تھا کہ یہ شخص جو میرے ساتھ ہرن مارکہ وسکی اور کریون۔ کے سگریٹ پیتا رہا ہے اور میری ہر بات مانتا رہا ہے، فلم سازی کے معاملے میں وہی کرے گا جو اس کا گھڑی ساز دماغ مناسب سمجھتا چنانچہ یہی ہوا، اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ دبے پاؤں فلم "نوکر" کی پروڈکشن سے باہر نکل جاؤں گا۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ شوکت چونکہ میرے اڑیل مزاج سے واقف تھا۔ اس لئے اس نے میرے اس فرار کو سکون کے لئے اچھا ہی سمجھا۔ کیونکہ بہت ممکن تھا کہ اگر میں کسی نکتے پر اڑ جاتا تو فلم کی شوٹنگ مہینوں کھٹائی میں پڑی رہتی۔

مجھے اس سے شکایت تھی۔ اس کو بھی اپنی جگہ یقیناً ہو گی۔ مگر ہمارے دوستانہ تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اس سے بیشتر عرض

کرچکا ہوں کہ ملک میں سیاسی گڑبڑ کے باعث فلم انڈسٹری کی حالت بالکل چھوئی موئی کی سی تھی۔ کسی نے اسٹول پر چڑھ کر "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگایا تو کئی فلموں کا اسقاط ہو جاتا تھا۔ یوں بھی ان دنوں جنگ کے باعث خام مال قریب قریب نایاب تھا۔ حالات چونکہ غیر یقینی تھے اس لئے بہت کم فلم ڈائرکٹروں کی مالی حالت اچھی تھی۔ پروڈیوسروں کے پاس ایک گھڑا گھڑایا اور بہت معقول بہانہ موجود تھا کہ روپیہ کہاں سے لائیں، جنگ شروع ہے۔ آج کریٹ کی لڑائی ہے، کل فن لینڈ کی۔ پرسوں جاپان کے حملے کا خطرہ ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو یہی وہ زمانہ تھا جب پروڈیوسروں اور سرمایہ لگانے والے مارواڑیوں نے جھولیاں بھر بھر کے کمایا۔

شوکت کا اس دوران میں ایک اور جگہ کنٹریکٹ ہوا۔ غالباً سیٹھ نوروجی سے (بمبئی کی زبان میں جوہری کی بگڑی ہوئی شکل) یہ ایک بڑا بدخود غلط قسم کا انسان تھا۔ بڑے ادنیٰ درجے سے تعلق رکھتا تھا، مگر جنگ نے اس کو سیٹھ بنا دیا تھا۔ اب وہ کھل کھیلنا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے ایک فلم کمپنی کھڑی کر دی تھی۔ دو چار موٹریں لے لی تھیں اونچی جگہوں پر تو اس کا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا، مگر وہ ایکسٹرا لڑکیوں کو پھانسنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

اس سیٹھ سے شوکت کا کنٹریکٹ ہوا۔ تو اس نے تین ہزار روپے پیشگی دیئے۔ میں شوکت کے ساتھ تھا۔ جب چیک کیش ہو گیا۔ تو میں نے روپے اس سے لے لئے اور اس سے کہا "چلو ڈاک خانے چلیں۔"

ڈاک خانے پہنچ کر میں نے وہ روپے سب کے سب شوکت کے گھر رجسٹری اور بیمہ کرا کے بھیج دیئے۔ میرا خیال ہے نور جہاں کو میری یہ حرکت یقیناً ناگوار گذری ہو گی۔ لیکن میرا اس سے کیا سروکار ہے۔

اسی دوران میں شوکت کو میں نے مجبور کیا کہ وہ اپنی زندگی کا بیمہ کرا لے۔ میری بہت کم باتوں کو رد کرتا تھا۔ فوراً مان گیا۔ چنانچہ دس ہزار روپے کی پولیسی لے لی گئی ـــــ معلوم نہیں میں یہ سب کچھ کیوں کر رہا تھا میں اب سوچتا ہوں تو مجھے اپنی یہ تمام حرکات بزرگانہ ہونے کے بجائے طفلانہ معلوم ہوتی ہیں۔ صاف اور دوں کو نصیحت اور خود میاں فصیحت والا معاملہ تھا۔

نور جہاں اب خوب نکھر گئی تھی ـــــ مرد کی قربت بھی عورت کے حسن کے لئے کتنی ضروری ہوتی ہے ـــــ اس کے جسم کے خطوط اب واضح شکل اختیار کر چکے تھے۔ وہ تمام خالی جگہیں جو لاہور میں پُر نہ ہوئی تھیں۔ یہاں بمبئی میں پُر ہو گئی تھیں اور اس پر جسم کی لذتوں کے قریب قریب

تمام اسرار منکشف ہو چکے تھے۔ نور جہاں گو اب بھی لوگوں کی زبان پہ بے بی نور جہاں تھی۔ مگر وہ عشق و محبت کا جھولا جھول جھول کر ان تمام جھونٹوں سے آشنا ہو چکی تھی جو اس کی زیستوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

ایک دن آؤٹ ڈور شوٹنگ تھی۔ بمبئی کے مضافات میں کسی کا ایک خوبصورت باغ تھا۔ جس کو شوکت نے منتخب کیا تھا۔ کیمرے کے لینس کے ساتھ ریڈ فلٹر لگا کر منظر کشی کرنا تھی کہ دن کی بجائے رات معلوم ہو جو دھوپ ہو وہ چاندنی نظر آئے۔

شوکت نے اصرار کیا کہ میں اس کے ساتھ ضرور چلوں مجھے دیر ہو گئی۔ اس لئے میں سیٹھ دیا س کی گاڑی میں وہاں پہنچا۔ نور جہاں کو میں نے لوکیشن پر دیکھا۔ تو میری آنکھوں کو زبردست دھکا لگا۔ عجیب و غریب لباس پہنے تھی۔ لباس کی وضع قطع میرے لئے نئی نہیں تھی۔ معمولی شلوار قمیص تھی۔ مگر اس میں آنکھوں کے لئے بڑی خارش پیدا کرنے والی حدت تھی۔

شلوار جالی کی تھی۔ جسے انگریزی میں "نٹ" کہتے ہیں عام طور پہ یہ کپڑا کھڑکیوں کے پردوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ معلوم نہیں یہ نور جہاں کی اپج تھی یا سید شوکت حسین رضوی کی ـــــ مگر وہ یہ لاکھوں کھڑکیاں

والی شلوار پہنے تھی۔ جس میں اس کی ٹانگیں بغیر کسی تکلیف کے چھن چھن کے باہر آ رہی تھیں۔ قمیص بھی اسی کپڑے کی تھی۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجیے کہ اس ملبوس نے نورجہاں کو ڈھانکنے کی کتنی کوشش کی ہوگی۔

شوبھنا سمرتھ بھی موجود تھی۔ نورجہاں کو اس لباس میں دیکھ کر میں تو واللہ بوکھلا گیا تھا۔ ایسا لباس، پھر روشنی کے پیش منظر میں۔ میں نے اپنی زخمی نگاہیں ادھر سے ہٹائیں اور شوبھنا کے پاس چلا گیا کہ وہ مستور تھی۔

شوبھنا سمرتھ تعلیم یافتہ عورت ہے۔ گفتگو کا سلیقہ رکھتی ہے چونکہ اچھے مرہٹی خاندان کی ہے۔ اس لیے اس میں ماکٹ پن (بمبئی کی زبان میں) نہیں۔ بڑی باتمیز عورت ہے۔ وہ بھی اس فلم میں کام کر رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ گھاس کے ایک تختے پر بیٹھ گیا اور اپنی وہ کوفت اور اپنا وہ تکدر دور کرتا رہا جو نورجہاں کا کھڑکیوں والا لباس دیکھ کر میرے دل و دماغ میں پیدا ہوا تھا۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں، مجھے فلم "نوکر" سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ شوکت اپنی من مانی کر رہا تھا اور میں اس میں دخل دینے سے کتراتا تھا کہ مبادا اس کے میرے تعلقات خراب ہو جائیں۔ نورجہاں سے اس کے گھر میں کئی مرتبہ ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے اس

کا جب اور زیادہ غور سے مطالعہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی ہے، اُسی کی خصوصیات اس میں بدرجہ تم موجود ہیں۔ اس کی ہر حرکت میں ایک بناوٹی ادا تھی۔ ایک نخرہ تھا، جسے سنجیدہ نگاہیں شاید ہی قبول کر سکیں۔

مجھے تعجب ہے، کہ شوکت ٹھیٹھ ہندوستانی، (یعنی یو۔ پی کا باشندہ) اور وہ ٹھیٹ پنجابی،—— ایک لحاظ سے "جنٹی"—— گاؤں کی مٹیار —— لیکن دونوں بہت خوش تھے۔ شوکت پنجابی نما اُردو بولنے کی کوشش کرتا اور وہ اُردو نما پنجابی۔ خاصی دلچسپ چیز تھی۔

فلم "نوکر" ختم ہوئی تو شوکت اور میرے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ وہ عشق کے جھوٹے جھول کر اب کاروباری دھندوں میں مشغول ہو گیا تھا، اور میں اپنے کاموں میں۔ گاہے گاہے کسی فلم کمپنی کے دفتر میں، یا سڑک پر اس سے ملاقات ہو جاتی تھی، مگر وہ بھی چند منٹوں کی خیر خیریت دریافت کی اور اپنی اپنی راہ لی۔

فلم انڈسٹری کی حالت اب بہتر تھی۔ جنگ کا خوف پروڈیوسروں کے سر سے اُتر چکا تھا اور فلم انڈسٹری کے تمام متعلقین کو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ زمانہ کمانے کا ہے۔ چنانچہ لاکھوں روپے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔

شوکت ذہین ہونے کے علاوہ کاروباری آدمی بھی ہے۔ چنانچہ اُس نے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھایا اور کچھ عرصے کے بعد اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کی اور ایک بڑا کامیاب فلم بنایا۔ یوں تو اُس کی ساکھ ویسے ہی قائم تھی کہ فلم انڈسٹری کے لوگ اُسے ایک قابل ڈائرکٹر اور ماہر ایڈیٹر مانتے تھے لیکن جب اُس نے اپنی ذاتی فلم کمپنی کھڑی کی تو انڈسٹری کے حلقوں میں اس کا وقار اور بھی بڑھ گیا۔

عام طور پر ڈائرکٹر یا پروڈیوسر فلمی دُنیا میں کسی ایکٹرس سے صرف اس لئے شادی نہیں کرتے ہیں کہ وہ ان کی کشتیٔ حیات میں پتوار کا کام دے۔ معلوم نہیں شوکت نے نور جہاں سے کیا اسی مقصد کے پیش نظر شادی کی تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اس سے شادی نہ بھی کرتا تو بھی اس کی آمدنی میں روز افزوں ترقی ہوتی رہتی۔ اس لئے کہ اپنے فن کو جانتا ہے اور مزدوروں کی طرح مشقّت کر سکتا ہے۔

مجھے معلوم نہیں، شوکت بمبئی کو چھوڑ کر پاکستان کیوں آیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بڑا کٹڑ قسم کا مسلمان ہے۔ اگر وہاں بمبئی میں کسی نے مسلمانوں کے خلاف ایک جملہ بھی کہہ دیا ہوتا تو مجھے یقین ہے وہ اس کی کھوپری بیچ کش سے کھول دیتا اور اس کی اصلاح کرنے کی ناکام کوشش کرتا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نور جہاں نے اُسے مجبور کیا ہو

کہ اُسے لاہور بہت پیارا ہے۔ کیونکہ پنجابیوں کے کہنے کے مطابق

"لاہور لاہور ہے۔"

بمبئی میں وہ بہت کامیاب تھا۔ اس نے ایک دو فلم ایسے بنائے تھے۔ جن سے اس کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ وہ کروڑوں روپے وہاں پیدا کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے پاکستان کو اپنا گھر بنایا۔ اس کا گھر یلی ساز دماغ جو سوئی کی خفیف سی غلط حرکت برداشت نہیں کر سکتا۔ یہاں پاکستان کی فلم انڈسٹری کے لئے جو حالت نزع میں تھی کام آیا۔

اس نے شوری کا جلا ہوا، سڑا ہوا، نہایت شکستہ اسٹوڈیو حاصل کیا اور اسے ایک اعلیٰ ترین نگار خانے میں تبدیل کر دیا۔

آپ میں سے بہت کم حضرات جانتے ہوں گے کہ شاہ نور اسٹوڈیو میں جو لمبی کیبل لٹکی ہے، اس میں شوکت حسین رضوی کا ہاتھ ہے جو پیچ لگا ہے اس پر شوکت کے پیچ کش کا نشان ہے۔ وہاں چھوٹے سے لوٹے سے لیکر بھاری بھاری ٹی کی بھاری بھر کم مشینری تک سب اس کے ہاتھ کی لگی ہے۔

یہ بہت بڑا وصف ہے —— اتنا بڑا کہ اس کے اور دوسروں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ ہر بات میں عملی طور پر دخل دینے سے اس نے کئی گڑبڑ گھوٹالے (بمبئی کی زبان میں) کئے ہیں۔ لیکن وہ بڑے ٹھاٹ سے رہتا ہے، لیکن میں آپ کو ایک پُرلطف قصہ سناتا ہوں۔

یہاں لاہور میں آکر بھی وہ میرا دوست ہے۔ میری اکثر مدد کرتا رہا ہے۔ ایک بار میں اس کے پاس گیا۔ اس کی بے داغ سفید قمیص کے بٹن موجود نہیں تھے۔ میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ اس نے مسکرا کر کہا "یہ کیا بتاؤں یار ——— پیسے ہی نہیں کہ بٹن خرید سکوں"۔

جب میں نے اس سے سگرٹ طلب کیا۔ تو اس نے مجھے بتایا کہ "دس روز سے وہ سگرٹ اُدھار لے رہا ہے"۔

یہ اس شخص کی حالت تھی۔ جس کے سٹوڈیو میں لوگوں کو ریفریجیریٹر کا ٹھنڈا پانی ملتا ہے۔ جہاں پھول کھلتے ہیں۔ جہاں کئی مالی کام کرتے ہیں۔ جہاں سینکڑوں مزدور ہیں۔ جہاں نورجہاں ہے جو اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے پہنتی ہے اور موٹروں میں گھومتی ہے۔

نورجہاں کے متعلق کئی افواہیں مشہور ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ حقیقت پر مبنی بھی ہوں، لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ دو نہایت پیارے بچوں کی ماں ہے۔ جو چیفس کالج کے صاف ستھرے ماحول میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وہ ان سے پیار کرتی ہے۔

پچھلے دنوں چیفس کالج میں ایک جلسہ تھا جس میں ننھے منے بچوں نے حصہ لیا تھا۔ اس میں ایک ڈانس تھا۔ رادھا کرشنا ڈانس۔ نورجہاں کا

بڑا لڑکا ایک گوپی بنا ہؤا تھا۔ اس نسوانی لباس میں وہ بہت پیارا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا رقص بھی بہت خوب تھا۔

نور جہاں یقیناً رقص جانتی ہے۔ معلوم نہیں اس نے اپنے اکبر کو خود تعلیم دی ہے یا وہ خود بخود خون کے ذریعے سے یہ سب کچھ سیکھا ہے۔ بہر حال اب دیکھنا ہے کہ اکبر اور اصغر جو کہ ایچیسن کالج میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آگے چل کر کیا بنتے ہیں؟

کیا یہ بیری موروں اور پرتھوی راجوں کا خاندان بنے گا؟ —— فی الحال ہم اس کے متعلق کیا کچھ کہہ سکتے ہیں؟

نور جہاں ذرا بد دماغ ہے۔ اس کو اپنے حسن پر تو ناز نہیں ہونا چاہیئے کہ ایسی کوئی چیز اس میں نہیں ہے۔ ایک فقط آواز ہے، گلا ہے جو نور سے بھرا ہے۔ اس پر اگر اسے ناز ہے تو بجا ہے، مگر بد دماغ ہونے کا یہ پھر بھی کوئی صحیح جواز نہیں۔

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ میری بیوی نے بمبئی میں مجھ سے کہا "آپ نور جہاں کو جانتے ہیں۔ وہ ہمارے گھر کئی مرتبہ آ چکی ہے، کیا وہ اب نہیں آ سکتی۔ میری چند سہیلیاں اس سے ملنا چاہتی ہیں۔"

میں نے اس سے کہا "کیوں نہیں آ سکتی۔ ہزار مرتبہ آ سکتی ہے۔"

میں نے شوکت سے کہا تو اس نے دوسرے روز ہی اسے

مجیبد یا۔ میں نے بہت سی ایکٹریسیں دیکھی ہیں۔ بڑے اور نچلے پائے کی، بہت مشہور، بہت معروف، مگر ان میں مجھے وہ تکلف نظر نہ آیا جو نور جہاں میں ہے۔ وہ بنتی ہے، اس کی مسکراہٹ، اس کی ہنسی، اس کا سلام اس کی مزاج پرسی، سب مصنوعی ہی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں، یہ چیز اس کی طبیعت میں کیسے داخل ہوئی۔ بعض اوقات جب میں اس کی اور شوکت کی ازدواجی زندگی کا تصور کرتا ہوں تو مجھے وہ بھی مصنوعی سی دکھائی دیتی ہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایسی نہیں۔

نور جہاں آئی، سب سے پہلے پُرخلوص تپاک سے، جسے میں اب بھی مصنوعی سمجھتا ہوں، ملی، میں چاہتا تھا کہ عورتوں کو چھوڑ کر چلا جاؤں کہ وہ آزادانہ طور پر گفتگو کرسکیں گی، مگر میری بیوی کی ایک سہیلی نے اصرار کیا کہ میں موجود رہوں اور نور جہاں سے کہوں کہ وہ گانا گائے۔

میں نے چنانچہ بڑے بے تکلف انداز میں نور جہاں سے کہا کہ بھئی ایک دو گانے ہو جائیں کہ یہ لوگ تمہاری آواز کا "زندہ ناچ دگانا" سُننا و دیکھنا چاہتی ہیں۔

نور جہاں نے ایک پُرتکلف ادا سے جواب دیا "نہیں منٹو صاحب! پھر کبھی .... میرا گلا ٹھیک نہیں۔"

میں کباب ہو گیا۔ اس کا گلا بالکل ٹھیک تھا۔ اس کا گلا فولاد کا گلا ہے،

جو کبھی خراب ہی نہیں ہو سکتا۔ صریحاً نخرے کر رہی تھی۔ میں نے اس سے پھر کہا ـــــ "نورجہاں، یہ بہانہ یہاں نہیں چلے گا ـــــ تمہیں گانا پڑے گا۔ میں تو تمہیں ہزار مرتبہ سُن چکا ہوں۔ مگر ان لوگوں کو اشتیاق ہے، اس لئے تمہیں اچھے بُرے گلے کے ساتھ ہی گا دینا چاہیئے۔"

بہت دیر تک اُدھر سے انکار، اِدھر سے اصرار ہوتا رہا۔ میری بیوی نے کہا کہ جانے دو، جب وہ نہیں گانا چاہتیں۔ تو آپ اس قدر زور کیوں دیتے ہیں۔ مگر میں بھی ایک ضدی ہوں۔ نورجہاں کے پیچھے پڑ گیا آخر اس کو فیض کی وہ غزل گانی پڑی۔ ؎

آج کی رات سازِ دردِ نہ چھیڑ

کمبخت نے کیا دُھن بنائی تھی اور کیا آواز تھی کہ اب اتنے برس گذر جانے پر بھی میرے کان اس شہد بھری آواز کو سُن سکتے ہیں۔

نورجہاں کے کئی عاشق ہوں گے۔ میں ایسے کئی باورچیوں کو جانتا ہوں جو چولہے کے پاس نورجہاں کی تصویریں لگا کر اپنے صاحبوں اور میم صاحبوں کا کھانا پکاتے ہیں اور اس کے گائے ہوئے گیت اپنی گلو گیری آوازوں میں گاتے ہیں۔

گھروں کے ان نوکروں کو بھی میں جانتا ہوں جو نمی، نرگس اور کامنی کوشل کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن نورجہاں کے والا و شیدا ہیں۔ جہاں

کہیں اس کی تصویر مل جائے، کاٹ کر اپنے ٹوٹے ہوئے ٹرنک میں رکھ لیتے ہیں اور فرصت کے وقت دیکھ دیکھ کر اپنی آنکھیں سینکتے ہیں۔ نورجہاں کو اگر کوئی بُرا کہے تو لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

اور میرے گھر میں اس کا ایک عاشق زار موجود ہے وہ ہر خوبصورت لڑکی، ہر دلہن، ہر پرکشش عورت کو نورجہاں کہتا ہے۔ اس کو نورجہاں کے گائے ہوئے گانے قریب قریب سب یاد ہیں۔ وہ خود بڑا حسین ہے لیکن جانے اُسے نورجہاں کی کون سی ادا بھا گئی ہے کہ وہ دن رات اسی کا ذکر کرتا ہے۔

وہ میرا قریب ترین عزیز ہے۔ میری سالی اور میرے بھانجے کا لڑکا ہے۔ اس کا نام شاہد جلال ہے۔ ہم سب اسے پیار سے ٹاکو کہتے ہیں۔ اس کو ہم سب بہت سمجھا بجھا چکے ہیں کہ دیکھو تم نورجہاں کا خیال چھوڑ دو۔ وہ ایک بیاہتا عورت ہے۔ جس کے کئی بچے ہیں۔ تمھاری اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔ مگر وہ نہیں مانتا۔

فلم دیکھتا ہے لیکن اگر اس میں نورجہاں نہ ہو تو اُسے بہت کوفت ہوتی ہے۔ یہ کوفت، وہ گھر آکر نورجہاں کے گائے ہوئے گانے گا کر دور کرتا ہے اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے کہتا ہے کہ مجھے اور کوئی نہیں چاہیئے۔ صرف نورجہاں چاہیئے۔

پچھلے دنوں اس کے دادا میاں جلال دین، شوکت رضوی کے پاس گئے تھے۔ انھوں نے اس سے کہا تھا۔ کہ دیکھو تمھاری بیوی کا ایک عاشق پیدا ہو گیا ہے۔ جو بُری طرح اس پر لٹو ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کسی روز نورجہاں کو لے اُڑے اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ۔

وہ بہت حیران ہُوا۔ اس لئے کہ میاں صاحب موصوف نے یہ بات شوکت کو بتائی تھی۔ پہلے تو وہ جھینپا، پھر اس نے پوچھا "میاں صاحب وہ کون شخص ہے؟"

میاں صاحب نے مسکرا کر اس سے کہا: "میرا پوتا"

"آپ کا پوتا؟ ——— کیا عمر ہے اس کی؟"

میاں صاحب نے جواب دیا "یہی! چار برس کے قریب!"

یہ حال ہی کی بات ہے۔ نورجہاں نے جب یہ ساری بات سُنی تو بہت محظوظ ہوئی۔ اس نے کہا کہ میں خود اپنے عاشق کے پاس جاؤنگی اور اس سے شادی کر لوں گی۔ شاہد جلال بہت خوش ہے۔ وہ اس دن کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہا ہے جب نورجہاں خود اس کے پاس چل کر آئے گی، اور وہ اُسے اپنی دلہن بنائے گا۔

پچھلے دنوں نورجہاں کے ایک اور عاشق کا قصہ سُننے میں آیا تھا، مگر وہ چار برس کا نہیں تھا، اچھا خاصا جوان تھا اور غالباً نائی یعنی حجام تھا۔ ہر وقت

اس کے گائے ہوئے گانے گاتا رہتا تھا اور اسی کی باتیں کر

آدمی نے اس سے کہا "کیا واقعی تمہیں نور جہاں سے محبت ہے" لکھا تھا۔

حجام نے بڑے پُر خلوص انداز میں جواب دیا "اس میں کیا شک ہے"

اس کے دوست نے اس کا امتحان لینا چاہا "اگر تمہیں اس سے تھے۔ یہ

سچی محبت ہے تو کیا جینوال کی طرح تم اس کے لئے اپنا گوشت بمبئی گو

سکتے ہو کہ کباب بنا کر اسے بھیجے جائیں" سونڈ

حجام نے تیز استرا نکال کر اپنے دوست کے ہاتھ میں دے دیا اور اپنے دوست سے کہا "جہاں سے چاہو میرا گوشت کاٹ لو"

اس کا دوست معلوم نہیں کس قسم کا انسان تھا۔ کہ اس نے اس کے بازو سے پاؤ بھر گوشت کا ٹکڑا اُسترے سے کاٹ کر الگ کر دیا اور خود بھاگ گیا کہ حجام صاحب اس قربانی کے بعد خون کے بہاؤ کے باعث بے ہوش ہو گئے۔

اس عاشق زار کو جب میو ہسپتال میں داخل کیا گیا اور جب اس کو تھوڑا سا ہوش آیا تو اس کی زبان پہ نور جہاں کا نام تھا۔

اس کے علاوہ آجکل نور جہاں پہ ایک مقدمہ بھی چل رہا ہے الزام یہ ہے کہ اس نے ایک نئی نویلی ایکٹرس نگہت سلطانہ کو اپنے اسٹوڈیو میں خوب مارا پیٹا، اس کا منہ نوچا، اور اس کی خوب مرمت کی۔ بمقدمہ

پچھلے دنوں ہے اس لئے میں اس کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ کہ توہین
پاس گئے تھے کے مترادف ہوگا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ نور جہاں نے اس
عاشق پیدا سلطانہ کی مرمت کیوں ضروری سمجھی۔ سچ پوچھئے تو میں نے پچھلے
روز نور جہاں ہی جب اس جھگڑے کی خبر پڑھی تو تہمت سلطانہ کا نام سُنا معلوم
ہوا یہ محترمہ کب اور کیسے ایکٹرس بنیں۔ سُنا ہے ڈھلکے کی پہننے والی
یہ بات شوکت ہوگا۔ دیکھئے اس مقدمہ کا کیا فیصلہ ہوتا ہے۔؟
وہ کون شوہر
نور جہاں کا خاوند بانکا چھبیلا سید شوکت حسین رضوی موجود ہے۔
اُسکی خوبصورت اولاد ہے۔ وہ ماں ہے۔ اس کیلئے لاہور کا حملم اپنی ران کا
نہیں تو اپنے بازو کا پاؤ بھر گوشت دے سکتا ہے۔ اس کا چار برس کا عاشق
شاہد جلال عرف ٹاکو ہے جو ہر وقت اس کو دولہن بنانے کے خواب دیکھتا رہتا
ہے۔ وہ باورچی ہیں جو اس کی تصویر چولہے کے پاس رکھ کر کھانا پکاتے ہیں
جو برتن مانجھتے وقت اُس کے گائے ہوئے گانے اپنی گن بھری آواز میں گاتے ہیں
اندلیوں اپنی مشقت کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں اور ایک میں ہوں جو اس کی
واہیات انگیا دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ معلوم نہیں وہ اتنی اُٹھان
میں کیا خوبصورتی دیکھتی ہے اور سید شوکت حسین رضوی اس زیادتی کی اجازت
کیوں دیتا ہے جو باذوق نگاہوں پر بہت گراں گذرتی ہے۔

"ہیں دیکھا تھا۔
پہ درٹ گرہے تھے۔ پیر
۔ لیکن جب بمبئی گ
ان کا صحیح ۔ مسوذ

نواب کاشمیری

یوں تو کہنے کو ایک ایکٹر تھا۔ جس کی عزت اکثر لوگوں کی نظر میں کچھ نہیں ہوتی جس طرح مجھے بھی محض افسانہ نگار سمجھا جاتا ہے۔ یعنی ایک فضول سا آدمی ۔ پر یہ فضول سا آدمی اس فضول سے آدمی کا جتنا احترام کرتا تھا وہ کوئی بے وضول شخصیت، کسی بے وضول شخصیت کا اتنا احترام نہیں کر سکتی ۔

وہ اپنے فن کا بادشاہ تھا۔ اس فن کے متعلق آپ کو یہاں کا کوئی وزیر کچھ بتا نہ سکے گا مگر کسی چیتھڑے پہنے ہوئے مزدور سے پوچھیں جس نے چونی دے کر نواب کاشمیری کو کسی فلم میں دیکھا ہے۔ تو وہ اس کے گن گانے لگے گا وہ آپ کو بتائے گا (اپنی خام زبان میں) کہ اس نے کیا کمال دکھائے۔

پچھلے دن
پاس گئے تھے ... یہ رسم ہے کہ جب ان کا کوئی بادشاہ مرتا ہے تو فوراً
... تھے کہ " بادشاہ مرگیا ہے —— بادشاہ مرگیا ہے ——
اشن پیدا سلطان زندہ ہو"

نور جہاں جب ... کاشمیری مرگیا ہے —— لیکن میں کس نواب کاشمیری کی
... یہ مختصر کر ... دعا مانگوں —— مجھے تو اس کے مقابلے میں تمام کردار نگار
... ہوگا ... ہیں۔

نواب کاشمیری سے میری ملاقات بمبئی میں ... خان کاشمیری
جو ان کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ ساتھ تھے۔ بمبئی کے ایک اسٹوڈیو میں ہم دیر
تک بیٹھے اور باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد میں نے اس کو اپنی ایک فلمی
کہانی سنائی۔ لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے مجھ سے بلا تکلف کہہ دیا ——

" ٹھیک ہے —— لیکن مجھے پسند نہیں۔"

میں اس کی اس بے باک تنقید سے بہت متاثر ہوا۔ دوسرے روز میں
نے اسے پھر ایک کہانی سنائی۔ سننے کے دوران میں اس کی آنکھوں سے
آنسو ٹپکنے لگے جب میں نے کہانی ختم کی تو اس نے رومال سے آنسو خشک
کر کے مجھ سے کہا " یہ کہانی آپ کس فلم کمپنی کو دے رہے ہیں —— بھڑوے کا
رول مجھے بہت پسند ہے۔"

میں نے اس سے کہا " یہ کہانی کوئی پروڈیوسر لینے کے لئے تیار نہیں۔"

نواب نے کہا "تو لعنت بھیجو اُن پر ۔۔۔"

نواب مرحوم کو پہلی بار میں نے "یہودی کی لڑکی" میں دیکھا تھا۔ جس میں رتن بائی ہیروئن تھی نواب عذرا یہودی کا پارٹ کر رہے تھے۔ میں نے اس سے پہلے یہودیوں کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ لیکن جب بمبئی گیا۔ تو یہودیوں کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ نواب نے ان کا صحیح۔ سو فیصد صحیح چربہ اُتارا ہے۔ جب نواب مرحوم سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ عذرا یہودی کا پارٹ ادا کرنے کے لئے اس نے کلکتہ میں یہ پارٹ ادا کرنے سے پہلے کئی یہودیوں کے ساتھ ملاقات کی۔ ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھا رہا اور جب اس نے محسوس کیا۔ وہ یہ رول ادا کرنے کے قابل ہو گیا ہے تو اس نے مسٹر بی۔ این سرکار مالک نیو تھیٹرز سے حامی بھر لی۔

جن اصحاب نے "یہودی کی لڑکی" فلم دیکھا۔ ان کو نواب کا شمیری کبھی بھول نہیں سکتا۔ اس نے بوڑھا بننے کے لئے اور پوپلے منہ باتیں کرنے کے لئے اپنے سارے دانت نکلوا دیئے تھے تاکہ کردار نگاری پر کوئی حرف نہ آئے۔

نواب بہت بڑا کردار نگار تھا۔ وہ کسی ایسے فلم میں حصّہ لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ جس میں کوئی ایسا رول نہ ہو، جس میں وہ سما سکتا ہو۔ چنانچہ وہ کسی فلم کمپنی سے معاہدہ کرنے سے پہلے پوری کہانی سنتا تھا۔ اس کے بعد گھر

جاکہ اس پر کئی دن غور کرتا تھا ـــــ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے چہرے پر مختلف جذبات پیدا کرتا تھا ـــ جب اپنی طرف سے مطمئن ہو جاتا تو معاہدہ پہ دستخط کر دیتا۔

اس کو آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں سے بہت محبت تھی، مگر تعجب ہے کہ یہ شخص جو عرصے تک امپیریل تھیٹریکل کمپنی کے ڈراموں میں اسٹیج پہ آتا رہا اور داد تحسین وصول کرتا رہا۔ فلم میں آتے ہی ایک دم بدل گیا ـــ اس کے لب و لہجے میں کوئی تھیٹر پن نہیں تھا۔ وہ اپنے مکالمے اسی طرح ادا کرتا تھا جس طرح کہ لوگ عام گفتگو کرتے ہیں۔

جس تھیٹریکل کمپنی کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اس میں نواب مرحوم نے "خوبصورت بلا" "نورِ وطن" اور "باغِ ایران" میں اپنی اداکاری کے ایسے جوہر دکھائے کہ اس کی دھاک بیٹھ گئی۔

نواب کاشمیری لکھنؤ کے بڑے امام باڑے کے سید مفتیٔ اعظم کے اکلوتے لڑکے تھے۔ قدرت کی یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہاں امام باڑے کا مفتیٔ اعظم اور کہاں منڈوہ۔ لیکن بچپن ہی سے اس کو ناٹک سے لگاؤ تھا۔

لکھنؤ میں ایک ناٹک کمپنی آئی۔ جس کا مالک اگروال تھا اس کمپنی کے کھیل نواب باقاعدہ دیکھتا رہا اور اس نے محسوس کیا کہ وہ اس سلسلے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، کھیل دیکھ کر گھر آتا تو گھنٹوں اس ڈرامے کے یاد رہے ہوئے

مکالمے اپنے انداز میں بولنا۔

اس ناٹک کمپنی میں چنانچہ ایک مرتبہ خود کو پیش کیا کہ وہ اس کا امتحان لیں۔ ڈائرکٹر نے جب نواب کی ایکٹنگ دیکھی اور مکالمے کی ادائیگی سنی تو حیران و ششدر رہ گیا۔ اس نے فوراً اسے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ اس کی تنخواہ کیا مقرر ہوئی۔

اس کمپنی کے ساتھ نواب کلکتہ پہنچے۔ اور اپنے مزید جوہر دکھائے۔ کاؤس جی کھٹاؤ جی نے ان کی اداکاری دیکھی تو ان کو الفریڈ تھیٹر یکل کمپنی میں لے لیا۔ ان دنوں وہ کیریکٹر ایکٹر مشہور ہو گئے۔

سیٹھ سکھ لال کرنانی جو الفریڈ تھیٹر کے مالک تھے۔ اور پرلے درجے کے گدھے اور بے وقوف تھے۔ انھوں نے اپنے حواریوں سے سنا کہ ایک ایکٹر جس کا نام نواب ہے، کمال کر رہا ہے۔ اس کا کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ تو انھوں نے اپنے ٹھیٹ انداز گفتگو میں کہا "نو لے آؤ اس سانڈ کو۔"

وہ سانڈ آ گیا ــــــ اور وہ سانڈ نواب کاشمیری تھا۔ اس کو زیادہ تنخواہ دے کر اپنے یہاں ملازم رکھا۔ وہ دیر تک میرا معذب ہے دو سال تک کرنانی صاحب کی کمپنی کے کھیلوں میں کام کرتے رہے۔

مجھے یاد نہیں کون سا سن تھا ــــــ غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب بمبئی کی "امپیریل فلم کمپنی" نے ہندوستان کا پہلا بولتا فلم "عالم آرا" بنایا تھا۔

جب بولتی فلموں کا دور شروع ہوا تو مسٹر بی۔ این سرکار جو بڑے تعلیم یافتہ اور سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔ انھوں نے جب نیو تھیٹرز کی بنیاد رکھی تو نواب کاشمیری کو جس سے وہ اکثر ملتے جلتے تھے۔ اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ تھیٹر چھوڑ کر فلمی دنیا میں آجائے۔

بی۔ این سرکار نواب کو اپنا ملازم نہیں محبوب سمجھتے تھے۔ ان کا ذوق بہت ارفع و اعلیٰ تھا۔ وہ آرٹ کے گرویدہ تھے۔ نواب مرحوم کا پہلا فلم "یہودی کی لڑکی" تھا۔ اس فلم کی ہیروئن "رتن بائی" تھی جس کے سر کے بال اس کے ٹخنوں تک پہنچتے تھے۔ اس فلم کے ڈائرکٹر ایک بنگالی مسٹر اٹھارتھی تھے۔ (جو اب دنیا تیاگ چکے ہیں) اس ٹیم میں حافظ جی اور میوزک ڈائرکٹر بالی تھے۔ اس تگڑم میں کیا کچھ ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے اس مضمون میں جائز نہیں۔

مسٹر اٹھارتھی نے جو بہت پڑھے لکھے اور قابل آدمی تھے مجھ سے کہا کہ نواب ایسا ایکٹر پھر کبھی پیدا نہیں ہوگا۔ وہ اپنے رول میں ایسے دھنس جاتا ہے جیسے ہاتھ میں دستانہ۔ وہ اپنے فن کا ماسٹر ہے۔

حافظ جی بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسا اچھا ایکٹر کبھی نہیں دیکھا۔

خیر! ان باتوں کو چھوڑیئے ـــ میں اب نواب ایکٹر کی طرف

رہا ہوں۔

ایک فلم میں جس کا عنوان غالباً "مایا" تھا۔ مرحوم کو جیب کترے کا پارٹ دیا گیا۔ اس نے جب ساری کہانی سنی تو انکار کر دیا کہ میں یہ رول ادا نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ میں جیب کترا نہیں ہوں ـــ میں نے آج تک کسی کی جیب نہیں کاٹی ـــ لیکن وہ کلکتے کے ایک واہیات ہوٹل میں ہر روز جاتا رہا۔ وہاں اس کی کئی جیب کتروں اور اٹھائی گیروں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں ـــ ممکن ہے کہ ان کے ساتھ اس نے شراب بھی پی۔۔۔ ـــ حالانکہ اسے اس کی عادت نہیں تھی ـــ ایک ہفتے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا چنانچہ اس نے فلم کمپنی کے مالک سے کہہ دیا کہ وہ جیب کترے کا رول ادا کرنے کے لئے تیار ہے۔

اس نے اس دوران میں کئی بدمعاشوں اور بدکرداروں سے دوستی پیدا کر لی تھی۔ ان کے تمام خصائص اس نے سیکھ لئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس رول میں کامیاب رہا۔ مرحوم کی زندگی یوں بڑی پاک صاف تھی، ان کے ایک عزیز ہے۔ ایم عماد ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا۔ کہ نواب بڑا طہارت پسند تھا۔ شیعہ تھا۔ کوئی کام بغیر استخارے کے نہیں کرتا تھا۔ سنی اور شیعہ ہونے میں کیا فرق ہے۔ لیکن جب ان دو فرقوں میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں تو اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ ان کے دماغوں میں مذہبی فتور ہے۔

میں تو نواب مرحوم کی بات کر رہا تھا ـــــ میں "دستک" کا سین کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب اس نے اپنی بدچلن بیوی کے گھنگرو چھنے دیئے ـــــ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں اتنا غم و اندوہ تھا جو چہرہ بھی ظاہر نہیں کر سکتا۔

"دلیپ داس" میں جب پرسنگل اس کے منہ پر تھپڑ مارتا ہے، تو وہ کچھ دیر اپنا چہرہ سہلاتا ہے جہاں ضرب آئی ہے۔ اور صرف اتنا کہتا ہے۔ "تم نے دینو بھائی کو مارا" ـــــ اور ـــــ اب میں کیا کہوں ـــــ سارے حساس تماشائی لرز جاتے ہیں۔

فلم "ضدی" میں جب اس کے بھتیجے کی بیوی (کلدیپ کور) اس کے پاس سے گزرتی ہے۔ وہ غصے کے عالم میں (پران ایکٹر سے) جا رہی ہوتی ہے ـــــ نواب کاشمیری مرحوم "انویلیڈ چیئر" میں بیٹھا ہے ـــــ اس کو دیکھتا ہے ـــــ اور عجیب فلسفیانہ انداز میں ہم کلامی کرتا ہے "پھر ـــــ چلی گئی"۔

میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن آپ کو فی الحال یہ بتا دینا چاہتا ہوں جو غالباً ابھی تک کسی پرچے میں شائع نہیں ہوا۔ کہ اس کی پہلی بیوی اپنے وطن کی تھی۔ اس لڑکی سے اس کی کب شادی ہوئی۔ اس کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا۔

اس بیوی سے اس کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ جب اس طرف سے ناامیدی ہوئی تو نواب نے اِدھر اُدھر کسی دوسرے رشتے کو ٹٹولنا شروع کیا۔ آخر پنس مرقدہ دربار شاہ اودھ کے بڑے لڑکے کی بیٹی کو اپنے نکاح میں لے لیا۔

جب یہ شادی ہوئی تو گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ نواب نے کوئی پروا نہ کی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس کی پہلی بیوی نے خودکشی کر لی۔ اب آپ اس خودکشی کا مختصر حال سن لیجئے۔ جب اس کی پہلی بیوی کو معلوم ہوا کہ اس کے خاوند نے دوسری شادی کر لی ہے تو اس نے نوکرانی سے تارپین منگوائی۔ اس پر مٹی کا تیل چھڑکا — اس کے بعد اپنے تن بدن پر بھی یہی تیل ملا — اپنے کپڑوں کو بھی اس سے مانوس کیا — پھر آرام سے چارپائی پر لیٹ کر دیاسلائی جلائی اور خود کو آگ لگا دی — وہ مر گئی — نواب کو معلوم بھی نہیں تھا کہ اس کی بیوی کوئلہ بن گئی ہے۔ وہ ابھی دوسری بیوی کے ساتھ دوسرے گھر میں تھا۔

جب نواب کو معلوم ہوا کہ وہ مر گئی ہے تو اس نے اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ وہ آخری وقت یہ وصیت کر گئی تھی کہ میری دس ہزار کی انشورنس پالیسی میں اپنے خاوند کے نام سپرد کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ ایک سو ساٹھ تولہ سونا بھی میں ان کی تحویل میں دیتی ہوں۔

نواب یہ وصیت سن کر بہت متعجب ہوا۔

اسے دیر تک مٹی کے تیل کی بُو آتی رہی تھی۔

میں اب بھی سوچتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں مٹی کا تیل ہوں۔ کیروسین ہوں۔ نواب کاشمیری ہوں —— کاشمیری میں بھی ہوں لیکن اتنا ظالم نہیں جتنا کہ وہ تھا۔ اس لئے کہ اس نے صرف اولاد کی خاطر اپنی پہلی بیوی کو خودکشی پر مجبور کر دیا ——

میں بھی کشمیری ہوں —— مجھے کشمیریوں سے بہت محبت ہے۔ لیکن میں ایسے کشمیریوں سے نفرت کرتا ہوں جو اپنی بیویوں سے برا سلوک کریں۔

میں نواب مرحوم کے فن کا قائل ہوں۔ میں اسے بہت بڑا فن کار مانتا ہوں —— لیکن جب بھی میں نے اسے اسکرین پر دیکھا تو مجھے گھاسلیٹ (مٹی کے تیل) کی بُو آئی۔

خدا کرے اسے دوزخ نصیب ہو، کہ وہاں وہ زیادہ خوش رہے گا۔

ستارہ

لکھنے کے معاملے میں مَیں نے بڑے بڑے کڑے مراحل طے کئے ہیں لیکن مشہور رقاصہ اور ایکٹرس ستارہ کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کرنے میں مجھے بڑی ہچکچاہٹ کا سامنا کرنا پڑا ہے آپ تو اسے ایک ایکٹرس کی حیثیت سے جانتے ہیں جو ناچتی بھی ہے اور خوب ناچتی ہے لیکن مجھے اس کے کردار کا مطالعہ کرنے کا بھی موقعہ ملا ہے جو عجیب و غریب ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں کئی عورتوں کے کردار و اطوار کا مطالعہ کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب ستارہ کے حالاتِ زندگی مجھے آہستہ آہستہ معلوم ہوئے تو میں چکرا گیا وہ عورت نہیں ایک طوفان ہے اور وہ بھی ایسا

طوفان جو صرف ایک مرتبہ آ کے نہیں ٹلتا۔ بار بار آتا ہے۔ ستارہ یوں تو میانہ قد کی عورت ہے مگر بلا کی مضبوط ہے۔ اس نے جتنی بیماریاں سہی ہیں میرا خیال ہے اگر کسی اور عورت پر نازل ہوتیں تو وہ کبھی جانبر نہ ہو سکتی۔ وہ طبعاً بہت حوصلہ مند ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ کسرت کی عادی ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ صبح سویرے اٹھ کر وہ کم از کم ایک گھنٹے تک ریاضت کرتی تھی اور یہ ریاضت کوئی معمولی ریاضت نہیں ہوتی تھی ایک گھنٹہ بھر بھرپور ناچنا ہڈیوں تک کو تھکا دیتا ہے مگر ستارہ مجھے کبھی تھکی تھکی دکھائی نہیں دی اصل میں اس میں وہ چیز ہے جسے انگریزی میں STAMINA کہتے ہیں بدرجہ اتم موجود ہے وہ تھکنے والی جنس نہیں دوسرے تھک ہار جائیں گے مگر وہ ویسی کی ویسی رہے گی جیسے اس نے کوئی مشقت نہیں کی اس کو اپنے فن سے پیار ہے اسی والہانہ قسم کا جو وہ مختلف مردوں سے کرتی رہی ہے۔

معمولی سے ڈانس کے لئے وہ اتنی محنت کرے گی جتنی کوئی رقاصہ عمر بھر نہیں کر سکتی اس کی طبیعت میں اپج ہے وہ ہمیشہ کوئی خاص بات کرنا چاہے گی۔ حیات پھرت جو ایک نٹنی میں ہو سکتی ہے اس میں ضرورت سے زیادہ موجود ہے وہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی نچلی نہیں بیٹھ سکتی اس کی بوٹی بوٹی تھرکتی رہتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ وہ نیپال کی رہنے والی ہے۔ مجھے اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ معلوم نہیں۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ ستارہ کے علاوہ اس کی دو بہنیں اور تھیں۔ یہ ترتشول یوں مکمل ہوتا ہے۔ تارہ، ستارہ اور الکنندہ۔ تارہ اور الکنندہ تو اب قریب قریب معدوم ہو چکی ہیں۔ میرا خیال ہے ان کا نام بھی کسی کو یاد نہیں ہوگا۔

ان تینوں بہنوں کی زندگی ویسے بہت دلچسپ ہے۔ تارہ کی کئی مردوں سے وابستگی رہی اس ہجوم میں ایک شوکت ہاشمی بھی ہیں جو اب تک کئی پاپڑ بیل چکے ہیں۔ حال ہی میں ان کی بیوی پورنیما نے ان سے طلاق لی ہے اور وہ اس سلسلے میں بڑے دردناک بیان دے چکے ہیں۔ الکنندہ کئی ہاتھوں سے گذری اور آخر میں بھارت کے شہرت یافتہ ایکٹر بلونت سنگھ کے پاس پہنچی اس کے پاس وہ ابھی تک ہے یا نہیں اس کا مجھے علم نہیں۔

ان تینوں بہنوں کی زندگی کی روداد اگر لکھی جائے تو ہزاروں صفحے کالے کئے جا سکتے ہیں لوگ مجھے کہتے ہیں کہ میں فحش نگار ہوں گندہ ذہن ہوں لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس دنیا میں کیسی کیسی ہستیاں موجود ہیں میں انہیں فحش نہیں کہتا۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ یا تو کوئی آدمی ماحول کے باعث مذموم حرکات کا مرتکب ہوتا ہے یا اپنی جبلت کے باعث۔

جو چیز آپ کو فطرت نے عطا کی ہے اس کی اصلاح نفسیاتی علاج

سے کس حد تک ہو سکتی ہے لیکن اگر آپ اس سے غافل رہے ہیں تو اس کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے یہ ذرا سوچنے کی بات ہے۔

تارہ، ستارہ اور الکنندہ تین بہنیاں کسی کے ہاں پیدا ہوئیں غالباً نیپال کے کسی گاؤں میں وہاں سے وہ ایک ایک کر کے بمبئی آئیں کہ فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کریں لیکن یہ مقدر کی بات ہے کہ صرف ستارہ کا ستارہ چمکا جو باقی دو تھیں وہ ٹمٹماتی رہ گئیں۔

ستارہ کے متعلق جیسا کہ میں اس مضمون کے آغاز میں کہہ چکا ہوں پوری تفصیل سے لکھتے ہوئے جھجکتا ہوں، وہ عورت نہیں کئی عورتیں ہے اس نے اتنے جنسی سلسلے کئے ہیں کہ میں اس مختصر مضمون میں ان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

انگریزی زبان میں ایسی عورت کو NAFOMANIC کہا جاتا ہے، یہ عورت کی ایک خاص قسم ہے جو ایک مرد کے علاوہ اور سینکڑوں سے تعلق قائم کرتی ہے۔

ستارہ کا میں جب بھی تصور کرتا ہوں تو وہ مجھے بمبئی کی پانچ منزلہ بلڈنگ معلوم ہوتی ہے جس میں کئی فلیٹ اور کئی کمرے ہوں اور یہ واقعہ ہے کہ وہ بیک وقت کئی مرد اپنے دل میں بسائے رکھتی تھی مجھے اتنا معلوم ہے کہ جب وہ بمبئی میں آئی تو اس کا تعلق ایک گجراتی فلم ڈائرکٹر سے قائم ہوا

جس کا پورا نام مجھے یاد نہیں رہا لیکن وہ ڈیسائی تھا۔ دبلا پتلا مریل قسم کا انسان لیکن تھا بہت خوبیوں کا مالک اپنے کام میں کافی ہوشیار تھا مگر قسمت نے اس کی یاوری نہ کی۔ چونکہ ضدی تھا اس لئے جگہ جگہ ٹھکرایا گیا۔ اس سے میری ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب سروج فلم کمپنی زندہ تھی ——— لیکن اصل میں زندہ درگور تھی۔ میری اس کی فوراً دوستی ہو گئی اس لئے کہ وہ فن شناس تھا اور ادبی ذوق بھی رکھتا تھا۔ اسی دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ ستارہ اس کی بیوی ہے لیکن اس سے جدا ہو گئی ہے۔ ڈیسائی کو مگر اس جدائی کا اتنا رنج نہیں تھا اس کی باتوں سے مجھے صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ اس عورت سے پورا نبٹ نہیں سکتا تھا۔

ستارہ اس زمانے میں کسی اور کے پاس تھی لیکن کبھی کبھی اپنے شوہر ڈیسائی کے پاس بھی آجاتی تھی، وہ خوددار انسان تھا اس لئے وہ اس سے عموماً بے اعتنائی برتتا تھا اور اسے مختصر ملاقات کے بعد رخصت کر دیا کرتا تھا۔

ہندوؤں کے مذہب کے مطابق کوئی عورت طلاق نہیں لے سکتی ڈیسائی سے ستارہ کی شادی ہندو قانون کے ماتحت ہوئی تھی اس لئے اب بھی وہ مسز ڈیسائی ہے حالانکہ وہ کئی مردوں سے منسلک ہو کر ان سے علیحدگی اختیار کر چکی ہے بہر حال یہ اس زمانے کی بات کر رہا ہوں جب ڈائرکٹر محبوب

کا ستارہ مائل بہ عروج تھا محبوب نے اسے اپنے کسی فلم میں لیا تو اس کے ساتھ ستارہ کے جنسی تعلقات فوراً قائم ہو گئے اس کی روداد میرا قلم بیان نہیں کر سکتا۔ صرف بتو (عشرت جہاں) کی زبان ہی بیان کر سکتی ہے۔

آؤٹ ڈور شوٹنگ کے سلسلے میں محبوب کو حیدرآباد جانا پڑا تھا۔ وہاں محبوب صاحب حسب دستور باقاعدہ نماز پڑھتے تھے اور باقاعدہ ستارہ سے عشق فرماتے تھے۔ میں یہ سب کچھ لکھنے میں ہچکچا رہا ہوں۔ اصل میں ستارہ ایک کیس ہسٹری ہے اس پر نفسیات کے کسی ماہر ہی کو لکھنا چاہیئے تھا۔ بمبئی میں ایک اسٹنڈ فلم سٹی تھا۔ محبوب نے غالباً اسی میں اپنی کوئی پکچر بنانا شروع کی تھی ان دنوں وہاں ساؤنڈ ریکارڈ کرنے والے مسٹر پی۔ این اروڑہ تھے (جناب شہور پروڈیوسر ہیں) بڑے محنتی قسم کے نوجوان تھے۔ فضل بھائی نے جو فلم سٹی کے کرتا دھرتا تھے ان کو ولایت بھیجا تھا کہ وہ صدا بندی کا کام سیکھ کے آئیں۔ اسی زمانے میں سیٹھ شہزاد علی حکیم بھی وہیں تھے اور لیبارٹری کے انچارج تھے۔ ڈائرکٹر محبوب سے تو ستارہ کا سلسلہ چل رہا تھا لیکن بقول دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست دہلی اس کا ٹانکا پی۔ این اروڑہ سے بھی مل گیا۔

ڈائرکٹر محبوب نے فلم ختم کیا تو ستارہ پی۔ این اروڑہ کے ہاں بطور بیوی یا داشتہ کے رہنے لگی۔ لیکن اس دوران میں ایک اور حادثہ در پیش

آیا۔ فلم سٹی ہی میں یا کسی اور سٹوڈیو میں جہاں ستارہ کام کر رہی تھی) ایک نووارد الناصر تشریف لائے، یہ بڑے خوبصورت جوان تھے کم عمر تازہ تازہ ڈیرہ دون سے تعلیم حاصل کرکے آئے تھے گال سُرخ و سپید تھے ان کو شوق تھا کہ فلمی دُنیا میں داخل ہوں۔

جب آئے تو فوراً انھیں ایک فلم میں رول مل گیا اتفاق سے اس کے کاسٹ میں ستارہ بھی شامل تھی جو بیک وقت پی این اروڑہ، ڈائرکٹر محبوب اور اپنے اصلی خاوند مسٹر ڈیسائی کے پاس آیا جایا کرتی تھی۔

معلوم نہیں یہ پہلے کی بات ہے یا بعد کی مگر ستارہ کی دوستی نذیر سے بھی ہو گئی جس کی پہلی داشتہ جو کہ ایک یہودن ایکٹرس یاسمین تھی اسے داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کن حالات میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ان دونوں میں گاڑھی چھننے لگی نذیر ستارہ کا فریفتہ تھا اور ستارہ نذیر پہ اپنی جان چھڑکتی تھی۔

میں نذیر کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت سخت مزاج کا آدمی ہے وہ عورت کو تابع رکھنے کا قائل ہے، عورت کا ذکر ہی کیا۔ مرد بھی جو اس کی ملازمت میں ہوں انھیں اس کی گالیاں اور گھرکیاں سہنا پڑتی ہیں۔

وہ آدمی نہیں دیو ہے لیکن بڑا مخلص دیو وہ میرا دوست ہے جب کبھی مجھ سے ملتا ہے سلام دُعا کے بجائے گالیاں دیتا ہے لیکن میں جانتا ہوں

کہ وہ بے ریا ہے اس کا دل خلوص سے معمور ہے۔

اس بے ریا اور مخلص آدمی نے ستارہ کو کئی برس برداشت کیا اس کی سخت گیر طبیعت کے باعث ستارہ کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ وہ اپنے پرانے آشناؤں سے راہ و ربط قائم رکھے۔ لیکن وہ عورت جو صرف ایک مرد کی رفاقت پر قانع نہ رہتی ہو اس کا کیا علاج ہے۔ ستارہ نے کچھ دیر کے بعد وہی سلسلہ شروع کر دیا جس کی وہ عادی تھی۔ اردو ڈرامہ النا صر محبوب اور اس کا خاوند ڈلیانی سب ہی اس کے التفات سے مستفید ہوتے رہے یہ چیز نذیر کی خوددار طبیعت پر بہت گراں گزرتی تھی وہ ایسا آدمی ہے کہ ایک مرتبہ کسی عورت سے تعلق قائم کرے تو اسے نبھانا چاہتا ہے مگر ستارہ کسی اور ہی آب و گل کی بنی تھی وہ نذیر جیسے آدمی سے بھی مطمئن نہیں تھی۔

میں اس میں ستارہ کا کوئی قصور نہیں دیکھتا جو کچھ بھی اس سے سرزد ہوا ہے اس کی جبلت کے باعث ہوا۔ قدرت نے اس کو اس طور سے بنایا ہے۔ کہ وہ بادہ بر جام ہی بنی رہے گی۔ کوشش کے باوجود وہ اپنی اس فطرت کے خلاف نہیں جا سکتی۔

یاسمین معتدل عورت تھی۔ خوبصورت، نسوانیت کا بڑا اچھا نمونہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے جب نذیر سے مستقل گھر بنا زندگی بسر کرنے

کا ارادہ ظاہر کیا تو نذیر نے جتنے ہزاروں اشخاص بہت سخت گیر سمجھتے ہیں
یاسمین کو اجازت دے دی کہ وہ جس کسی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی
ہے کر سکتی ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نذیر اور ستارہ کا جسمانی تعلق اتنی دیر کیسے قائم رہا۔ نذیر سے میری ملاقات ہندوستان سینے ٹون میں ہوئی یہ وہ زمانہ تھا جب فلم انڈسٹری نہایت نازک حالت میں تھی وہ اس وجہ سے فائنینسر بنتے باز تھا آج لاکھوں کے مالک ہیں دوسرے دن دیوالہ پٹ رہا ہے ——

ہندوستان سنے ٹون پہلے سرورج فلم کمپنی تھی۔ اس سے پہلے خدا معلوم اس کا کیا نام تھا۔ میں نے ایک کہانی "کیچڑ" کے عنوان سے لکھی جب میں نے سیٹھ نانو بھائی ڈیسائی کو سنائی تو اس نے بیحد پسند کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں جب کہ حکومت کی طرف سے سخت قسم کا احتساب عاید تھا کوئی پروڈیوسر اس کہانی کو فلمانے کی جرأت نہ کرتا، مگر نانو بھائی دلیر آدمی تھا اس نے کہانی لے لی مگر بعد میں مالی مشکلات درپیش آئیں تو وہ مجبور ہو گیا۔

نذیر کے لیے میں نے مزدور کا ایک اہم رول لکھا تھا جو اس کو بہت پسند تھا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ مالی مشکلات کے باعث یہ باغی فلم"

نہیں بنے گا۔ تو اس نے سیٹھ نانو بھائی ڈیسائی سے کہا کہ آپ یہ کہانی مجھے دے دیجئے میں اپنا سب کچھ بیچ کر اس کے فلمانے پر لگا دوں گا۔ مگر ایسی نوبت نہ آئی نانو بھائی کو کہانی پسند تھی چنانچہ کسی نہ کسی طرح سرمائے کا بندوبست ہو گیا۔ فلم کے ڈائرکٹر دادا گنجال تھے — گجراتی —

فلم مکمل ہو کر ریلیز ہو گیا۔ لوگوں نے اس کی تعریف کی، پسند کیا۔ مگر میں مطمئن نہ تھا۔ لیکن اس کا میرے موضوع سے کوئی اتنا زیادہ تعلق نہیں مجھے صرف یہ کہنا تھا کہ اس دوران میں نذیر کو اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کرنے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ اسی زمانے میں یاسمین اس سے رخصت ہونے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ نذیر عزم کا مالک ہے اس نے بہت جلد اپنا ذاتی فلم بنانے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے اس کا پہلا فلم "سندیسہ" تھا۔

اس کے بعد اس نے اپنا دوسرا فلم بنایا جس کا نام غالباً "سوسائٹی" تھا اس میں اس نے ستارہ کو بھی کاسٹ میں شامل کیا اور جو نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے۔ کہ وہ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے اور بہت دیر تک رہے لیکن اس دوران میں جہاں تک میں جانتا ہوں ستارہ اپنے پرانے دوستوں کے ہاں بھی آتی جاتی رہی۔ پی۔ این اروڑہ کے پاس وہ اکثر جاتی تھی

میں آپ کو ایک دلچسپ لطیفہ سناؤں۔ مجھے بمبئی چھوڑ کر دہلی جانا پڑا وہاں میں نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت اختیار کی۔ قریب قریب ایک سال تک میں بمبئی کی فلمی دنیا کے حالات وکوائف سے غافل رہا ایک دن اچانک میں نے نئی دلی میں ادوڑہ کو دیکھا۔ ہاتھ میں موٹی چھڑی۔ کمر دوہری ہو رہی تھی یوں بھی بیچارہ منحنی قسم کا انسان ہے مگر اس وقت بہت خستہ حالت میں تھا۔ بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہا تھا جیسے اس میں جان ہی نہیں۔ میں تانگے میں تھا اور وہ پیدل غالباً چہل قدمی کے لیے نکلا تھا۔ میں نے تانگہ روکا اور اس سے پوچھا کہ یہ قصہ کیا ہے اس کا حلیہ کیوں اتنا بگڑا ہوا ہے۔ اس نے ہانپتے ہوئے مگر ذرا پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ستارہ ـــ منٹو ستارہ" میں سب سمجھ گیا۔ میرا خیال ہے آپ کو بھی سمجھ جانا چاہیے۔ اب ایک اور لطیفہ سنیئے۔ الناصر جو اب بہت موٹا اور بھدا ہو گیا ہے۔ جب وہ شروع شروع میں فلم سٹی آیا تھا تو بہت خوبصورت تھا، بڑا نرم و نازک، سرخ و سپید ڈیرہ دون کی پہاڑی فضا نے اس کو نکھار دیا تھا، میں تو یہ کہوں گا کہ وہ نسائیت کی حد تک خوبصورت تھا اس میں وہ تمام ادائیں تھیں جو ایک خوبصورت لڑکی میں ہو سکتی ہیں پھر جب دہلی میں ڈیڑھ برس گزارنے کے بعد سید شوکت حسین رضوی کے بلانے پر بمبئی پہنچا تو اس سے میری ملاقات مزدا مووی ٹون میں ہوئی۔ وہ

گیٹ کے باہر کھڑا تھا میں حیرت زدہ ہو گیا۔ گالوں کا گلابی رنگ ندارد جسم پر پتلون ڈھیلی ڈھالی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکڑ گیا ہے پچک گیا ہے۔ میں نے اس سے بڑے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا "میری جان، یہ تم نے اپنی کیا حالت بنائی ہے" اس نے اپنا منہ میرے کان کے پاس لا کر سرگوشی میں کہا "ستارہ — میری جان — ستارہ"۔

جہاں دیکھو ستارہ — میں نے سوچا کہ یہ ستارہ صرف زردیاں پیدا کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے ادھر پی۔ این امرہ انگلینڈ کا تعلیم یافتہ صدا بند، ادھر ڈیرہ دون اسکول کا پڑھا ہوا تیز لڑکا۔

الگ لے جا کر جب میں نے اس سے پوری تفصیل پوچھی تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ ستارہ کے چکر میں پڑ گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیمار ہو گیا جب اس کو اس بات کا احساس ہوا کہ اگر وہ زیادہ دیر تک اس چکر میں رہا تو وہ ختم ہو جائے گا۔ تو وہ ایک روز ٹکٹ کٹا کر ڈیرہ دون چلا گیا، جہاں اس نے تین مہینے ایک بسینے ٹوریم میں گذارے اور اپنی کھوئی ہوئی صحت کسی قدر حاصل کی، اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ وہ اس دوران میں مجھے ہندی زبان میں بڑے لمبے لمبے خط لکھتی رہی لیکن میں یہ خط پڑھ نہیں سکتا تھا البتہ ان کی آمد سے کانپ کانپ ضرور جاتا تھا اس نے پھر میرے کان میں کہا۔

"منٹو صاحب، بڑی عجیب و غریب عورت ہے۔"

ستارہ اصل میں ہے ہی عجیب و غریب عورت۔ ایسی عورتیں لاکھ میں دو تین ہوتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کئی مرتبہ خطرناک طور پر بیمار ہوئی۔ اس کو ایسے ایسے عارضے لاحق ہوئے کہ عام عورت کبھی جانبر نہ ہو سکتی۔ مگر وہ ایسی سخت جان ہے کہ ہر بار موت کو غچہ دیتی رہی۔ اتنی بیماریوں کے بعد خیال تھا کہ اس کے ناچنے کی قوتیں سلب ہو جائیں گی مگر وہ اب بھی اپنے عہدِ جوانی کی طرح ناچتی ہے۔ ہر روز گھنٹوں ریاض کرتی ہے۔ مالشئیے سے تیل کی مالش کراتی ہے اور وہ سب کچھ کرتی ہے جو پہلے کرتی آئی ہے۔ اس کے گھر میں دو نوکر رہتے ہیں، ایک مرد، ایک عورت۔ مرد عام طور پر اس کا ماشیا ہوتا ہے، جو عورت ہے اس کے متعلق میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ پرانی کہانیوں کی کٹنی معلوم ہوتی ہے جو آسمان میں تھگلی لگایا کرتی تھیں۔

وہ ململ کی باریک ساڑھی پہنتی ہے اتنی باریک کہ اس کا سارا ڈھیلا ڈھالا جسم اس میں سے چھن چھن کر باہر آتا رہتا ہے اور دیکھنے والوں کے لیے کراہت کا موجب ہوتا ہے۔ یہ عورت میں نے جب بھی دیکھی بہت کم گو، مگر بڑی تیز نظر دیکھی۔ اس کی عمر کم از کم پچپن برس کے قریب ہو گی مگر وہ جوانوں کے مانند چاق و چوبند تھی اس کی آنکھیں عقاب کی طرح دیکھتی تھیں۔

جب ستارہ اکیلی تھی ـــــ یعنی وہ کسی ایک کی ہو کے نہیں رہتی تھی

تو اس کا مکان واور کے "خداداد سرکل" میں تھا اور جو صفتیں یا قباحتیں ستارہ میں ہیں وہ بھی خداداد ہیں۔ نذیر جو اب سورن لتا سے منسلک ہے، بڑی خوبیوں کا مالک ہے۔ اس نے بہت دیر تک ستارہ کو برداشت کیا مگر جیسا کہ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں وہ ایک مرد کی عورت نہیں ہے چنانچہ جب نذیر تنگ آگیا اور اس کو حتمی طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ اس سے نباہ نہیں کر سکتا تو اس نے ایک روز اس سے ہاتھ جوڑ کر کہا "ستارہ مجھے بخش دو، مجھ سے جو غلطی ہو گئی ہیں اس کے لیے پشیمان ہوں اور تم سے معافی کا خواستگار۔"

نذیر ستارہ کو مارا پیٹا بھی کرتا تھا وہ اس سے ناخوش نہیں تھی ایسی عورتیں زد و کوب سے ایک خاص قسم کی جنسی لذت محسوس کرتی ہیں مگر ان منسلکہ مرد کب تک ہاتھا پائی کرتا رہے۔ وہ غریب بھی ایک عرصے کے بعد عاجز آجاتا ہے۔ اب اسی سلسلے کی ایک اور کڑی کے متعلق بھی سنیئے جس زمانے میں ستارہ نذیر کے یہاں تھی اسی زمانے میں نذیر کا بھانجا کے آصف بھی وہیں تھا۔ کے آصف بڑا تنومند نوجوان تھا، بڑا ہٹا کٹا، جوانی سے بھرپور جس کو عورت ذات سے شاید کبھی سابقہ ہی نہیں پڑا تھا، اپنے ماموں کے ہاں رہتا تھا اور اس سے فلمی صنعت کے متعلق واقفیت حاصل کر رہا تھا۔ دل میں سینکڑوں ولولے تھے، بڑے ارمان تھے، پھر فلمی دنیا میں آکر

اس نے عورتوں (اور وہ بھی ایکٹرسوں) کو قریب سے دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے ماموں نذیر اور ستارہ کے باہمی تعلقات بھی اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ آصف کی جوانی پھوٹ پڑی تھی یہ وہ دور تھا جب مرد اپنی جوانی کے جوش میں پتھروں کی دیوار سے بھی بھڑ جانا چاہتا ہے۔ اور ستارہ یقیناً ایک پتھریلی دیوار تھی جو کسی سے ٹکرانا چاہتی تھی۔

نذیر اس زمانے میں رنجیت فلم اسٹوڈیو کے عین سامنے ایک احاطے کے اندر رہتا تھا۔ بڑی غلیظ سی جگہ تھی۔ نذیر نے ایک پورا فلیٹ لے رکھا تھا۔ اسی میں اس کی قائم کی ہوئی "ہند پکچرز" کا دفتر بھی تھا۔ دو تین کمرے تھے۔ ان میں تخلیہ کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ پُرجوش نوجوان آصف کو ہر وہ پہلو دیکھنے کا موقعہ ملا جو مرد و زن کے باہمی تعلقات سے وابستہ ہوتا ہے۔

نوجوان آصف کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ بڑا حیرت انگیز۔ اس نے اپنے شادی شدہ دوستوں سے ازدواجی زندگی کے اسرار کئی بار سُنے تھے مگر اسے کبھی تعجب نہیں ہوا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ ایک بستر ہوتا ہے جس پر انسانی فطرت اپنا ازلی و ابدی کھیل کھیلتی ہے۔ مگر آصف کی آنکھوں نے جو کچھ ایک بار محض اتفاق سے دیکھا وہ بالکل مختلف تھا۔ بڑا خوفناک جس نے اس کی ہڈی ہڈی جھنجھوڑ دی۔ اس نے کئی بار کتوں کی لڑائی

دیکھی تھی جو ایک دوسرے سے بڑے وحشت ناک طریقے پر گتھ جاتے تھے۔ ایک دوسرے کو جھنجھوڑتے، بھنبھوڑتے، کاٹتے اور نوچتے تھے ——

اس کا تن بدن لرز گیا! اس نے سوچا یہ محبت وحبت سب بکواس ہے۔ اصل میں انسان درندہ ہے اور اس کی محبت ایک بڑی خوفناک قسم کی کشتی، مگر اس کو اکھاڑے میں اترنے اور ایسی کشتی لڑنے کا شوق ضرور تھا اس کے بازوؤں میں قوت تھی، اس کے بدن میں حرارت تھی، اس کے تمام پٹھے فولادی تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ صرف ایک بار اسے موقعہ دیا جائے تو وہ حریف کو چاروں شانے چت گرا دے۔

اس زمانے میں ڈائرکٹر نمبر ۲ پاکستان کا ذہین مگر بدقسمت ڈائرکٹر بھی نذیر کے ساتھ تھا۔ آصف اور وہ دونوں ہم عمر تھے۔ دونوں کنوارے اور خوابوں کی دنیا میں رہنے والے، آپس میں ملتے تو وہ عورتوں کی باتیں کرتے، ان عورتوں کی جو مستقبل میں ان کی ہونے والی تھیں پر جب ستارہ کا ذکر آتا تو دونوں کانپ اٹھتے اور ایک ایسی دنیا میں چلے جاتے جہاں جن، دیو اور چڑیلیں رہتی ہیں۔

ان کو کیا معلوم کہ "ٹمفومینک" عورت کیا ہوتی ہے۔ ان کو کیا معلوم کہ ستارہ کے مقابلے میں ایسی عورتیں بھی ہیں جنھیں اگر برف کی سل کہا جائے تو بجا ہے۔

لیکن ان کو نہ معلوم تھا کہ ستارہ نذیر کے ساتھ وفادار نہیں وہ ہرجائی ہے یوں تو نذیر کی "ہول ٹائم" داشتہ کے طور پر رہتی ہے مگر پی-این اروڑہ کے پاس بھی جاتی ہے اور کبھی کبھی اپنے پتی ڈیسائی کے پاس بھی جو بیچارہ بڑے حسرت کے دن گذار رہا تھا— اور کچھ اور بھی تھے جن میں الناصر بھی شامل تھا۔

دونوں چکرائے چکرائے رہتے تھے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ نذیر کے بستر کی ہر شکن کا پس منظر ان کو معلوم تھا۔ نذیر کے کھردرے اور گہرے سانولے رنگ کے چہرے کی گینڈے ایسی سخت کھال پر جو آئے دن داغ دھبے پڑتے تھے اس کا جواز بھی ان کو معلوم تھا۔ لیکن اس قدر دونوں کو یقین تھا کہ یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چلے گا مگر وہ چلتا رہا اپنے معمول کے مطابق۔

صبح سویرے ستارہ اُٹھتی اور دوسرے کمرے میں ریاض شروع کر دیتی۔ یہ بھی حیرت ناک چیز تھی کہ صبح اُٹھتے ہی دو گھنٹے لگاتار درویشوں کی مانند ناچتی رہے۔ ایسے ایسے توڑے لے کہ زمین گھوم جائے۔ طبلچی کے ہاتھ شل ہو جائیں۔ مگر اسے کچھ نہ ہو۔ ریاضت کے بعد وہ اپنے ایک مخصوص مالشیئے سے مالش کراتی تھی اس کے بعد نہا دھو کر وہ نذیر کے کمرے میں جاتی جو کہ سو رہا ہوتا۔ اس کو جگاتی اور اپنے ہاتھ سے دودھ

یا خدا معلوم کس چیز کا ایک پیالہ اسے زبردستی پلاتی۔ اور ایک دوسرا ناچ شروع ہو جاتا۔ یہ سب کچھ آصف اور نیر کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ ان کی عمر تجسس کی عمر تھی جب آدمی خالی کمروں میں بھی خواہ مخواہ کھڑکی کی درزوں سے جھانک کر دیکھتا ہے۔ روشندانوں سے بھرے کمروں کا جائزہ لیتا ہے۔ ذرا سی آواز آنے پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ ان میں معانی بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نیر آصف کے مقابلے میں جسمانی لحاظ سے بہت کمزور تھا۔ اس کی جنسی خواہشیں بھی اسی لحاظ سے معتدل تھیں مگر آصف کے مضبوط اور تنومند جسم کی رگ رگ میں بجلی بھری ہوئی تھی جو کسی پر گرنا چاہتی تھی۔ اسی لئے آصف چاہتا تھا کہ اندھیری رات ہو، آسمان پر کالے بادلوں کا ہجوم ہو، کان بہرے کر دینے والی بجلی کی کڑک اور طوفان باد و باراں میں وہ کسی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے اور اسے کھینچتا کہیں دور لے جائے جہاں پتھروں کا بستر ہو۔

نذیر کا عزیز ہونے کے باعث ستارہ گھنٹوں آصف کے پاس بیٹھی رہتی اور ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی تھی، جوں جوں وقت گذرتا گیا آصف کا حجاب کم ہوتا گیا جو وہ لاہور سے اپنے ساتھ لایا تھا مگر اس کو اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ ستارہ کو ہاتھ لگاتا۔ کیونکہ وہ اپنے ماموں کی سخت گیر طبیعت سے واقف تھا اور اس سے ڈرتا تھا ــــ لیکن

اس دوران میں اتنا جان گیا تھا کہ ستارہ اس کی طرف مائل ہے۔ وہ جب بھی چاہے اس کی کلائی اپنے مضبوط ہاتھ میں پکڑ کر اسے جہاں چاہے لے جا سکتا ہے ـــــ مگر وہ گھپ اندھیری رات، وہ طوفانِ باد و باراں اور وہ بپھروں کا بستر!

آصف جھنجھلا رہا تھا کہ قدرت اتنی تعویق کیوں کر رہی ہے جو ہونا ہے آج ہی کیوں نہیں ہو جاتا۔ گاڑیاں جنھیں کل ایک دوسرے سے ٹکرانا ہے، آج ہی کیوں نہیں ٹکرا جاتیں، مگر یہ کیسے ہوتا جب کانٹا بدلنے والا کانٹا نہ بدلتا۔

وہ دو گاڑیوں کی طرح ایک پلیٹ فارم پر رُکتے تھے مگر ان میں فاصلہ ہوتا تھا۔ بہت معمولی سا فاصلہ۔ مگر جس طرح ایک گاڑی دوسری گاڑی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی اس لئے کہ وہ اپنی آہنی پٹڑیوں کے ساتھ جکڑی ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ بھی ایک دوسرے سے ہمکنار نہیں ہو سکتے تھے۔

جس طرح اِدھر کے مسافر اُدھر کے مسافروں سے کھڑکیوں میں سے سر باہر نکال نکال کر باتیں کرتے ہیں اسی طرح وہ بھی کرتے تھے، مگر فوراً ایک گاڑی اُدھر روانہ ہو جاتی اور دوسری اِدھر، آصف کو بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ مگر وہ گھپ اندھیری رات اور طوفانِ باد و باراں

کا منتظر تھا۔

آخر وہ گھپ اندھیری رات، طوفان باد و باراں، رعد و برق کی حیلہ ہولناکیوں کے ساتھ آ ہی گئی۔

بالآخر ستارہ کے کرتوت دیکھ کر نذیر بھونچکا ہو کے رہ گیا۔

نذیر کے سر سے اب پانی گذر چکا تھا۔ کافی لعن طعن کے بعد اُس نے ستارہ سے کہا کہ اب تم یہاں سے نہیں رہ سکتیں۔ اپنا بستر فوراً گول کر دو۔

ستارہ، کچھ بھی ہو، آخر عورت ذات ہے۔ نذیر کی سرزنش کے بعد اُس میں اتنی طاقت نہیں تھی۔ کہ وہ اکیلی اپنا بستر اگول کر سکتی۔ نذیر سے وہ کیسے مدد مانگتی۔ وہ غصے میں بپھرا، منہ میں جھاگ نکالتا باہر نکل کر اپنے دفتر میں جا بیٹھا۔ آصف نے اُس کے یہ تیور دیکھے تو اُس کو یقین ہو گیا کہ وہ اندھیری رات آ گئی۔

تھوڑی دیر وہ خاموش بیٹھا رہا، اُس کے بعد اُٹھا اور آہستہ آہستہ دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔ جہاں ستارہ پلنگ پر بیٹھی اپنی چوٹیں سہلا رہی تھی۔

چند باتوں ہی سے اُس کو معلوم ہو گیا کہ معاملہ ختم ہے۔ دل ہی دل میں وہ بہت خوش ہوا۔ چنانچہ اُس نے ستارہ کو ڈھارس دی، کچھ اس طور پہ

پر کہ ایک نیا معاملہ شروع ہو گیا۔

آصف نے اس کا بستر بوریا باندھا اور اس کے ساتھ اُس کے گھر واقع داور (خداداد سرکل) چھوڑنے گیا۔

یہاں ستارہ نے آصف کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

آصف نے جرأت سے کام لے کر ستارہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ اس کی کیا ضرورت تھی ستارہ ـــــ"

ستارہ نے اپنا ہاتھ آصف کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش نہ کی، مگر آصف مطمئن نہ تھا۔ تھوڑی دیر راز و نیاز کی باتیں ہوئیں، ستارہ نے آصف کو اپنے اُس سحر کا نمونہ بھی چکھایا، جس سے وہ اس وقت تک سینکڑوں مرد، دبلے پتلے، ہٹے کٹے، ٹھنڈی اور وحشی اپنی خواہشات کا غلام بنا چکی تھی۔

اگر دن ہوتا تو آصف کو یقیناً تارے نظر آجاتے مگر رات کو اُسے خداداد سرکل کے اس فلیٹ میں دن طلوع ہوتا نظر آیا ـــــ اُس کی مسرتوں کا دن۔ مگر وہ پھر بھی مطمئن نہیں تھا۔ اُس نے ستارہ سے کہا کہ دیکھو، تمہارا میرا سمبندھ بہت مضبوط ہونا چاہیئے۔ ہرجائی پن چھوڑو۔ بس ایک کی ہو جاؤ۔

ستارہ نے اُسے یقین دلایا کہ وہ آصف کے سوا کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر

بھی نہ دیکھے گی۔ آصف مطمئن ہو گیا۔ مگر اس خوف سے کہ ندیہ اُس سے اتنی دیر لگانے کی وجہ نہ پوچھ بیٹھے۔ عاشقِ صادق کی طرح اُس کا ہاتھ چوم کر چلا گیا، اور وعدہ کر گیا کہ وہ دوسرے روز ضرور آئے گا۔

وہ گیا، تو ستارہ اُٹھی، سنگار میز کے پاس جا کر اُس نے اپنے بال درست کئے۔ ساڑھی تبدیل کی اور کسی کی طرف آنکھ اُٹھائے بغیر نیچے اُتری اور ٹیکسی لے کر پی، این اروڑہ کے پاس چل گئی۔

جملہ معترضہ ہے۔ لیکن ہُوا کرے۔ کہنا یہ ہے کہ ستارہ کو مجھ سے سخت نفرت تھی۔ میں مصوّر کا ایڈیٹر تھا اور بے لاگ لکھتا تھا۔ بال کی کھال، اور نت نئی کے کالموں میں کئی بار میں نے اُس کی درگت بنائی تھی۔ لیکن بڑے سلیقے سے۔ اس میں کوئی سوقیانہ پن نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ناراض تھی۔ اور مجھے اس ناراضی کی سچ پوچھئے تو کوئی پروا بھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ مجھے اُس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اور یوں بھی فلمی ہستیوں سے دُور دُور ہی رہتا تھا۔

میں نے "نت نئی" یا بال کی کھال کے کالموں میں جب ندیہ اور اُس کی لڑائی کا ذکر ذرا نمک مرچ لگا کے کیا تو وہ بہت سیخ پا ہوئی اور اُس نے مجھے خوب خوب گالیاں دیں۔

اس کے بعد جب مجھے اپنے جاسوسوں کے ذریعے سے آصف

اور اُس کے خفیہ معاشقے کا پتہ چلا اور میں نے چھپنے ہوئے انشائیوں اور کتابوں میں اس کا ذکر اپنے کالموں میں کیا تو وہ بھنا گئی اور اُس نے آصف سے کہا، تم اس شخص کو پیٹتے کیوں نہیں، خود نہیں پیٹتے تو کسی سے پٹواؤ۔ یا کسی اور اخبار والے سے کہو کہ وہ اُسے اپنے اخبار میں ڈھیروں کے ڈھیر گالیاں دے۔

آصف، بڑے ظرف کا آدمی ہے۔ اُس میں بُردباری ہے۔ تحمل ہے مذاق سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے، حالانکہ ان پڑھ ہے۔ اُس نے ستارہ کی یہ باتیں اس کان سنیں اُس کان نکال دیں۔

معاملہ اب زیادہ نزاکت اختیار کر گیا تھا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا ہے۔ کہ ستارہ کس قسم کی عورت ہے۔ اگر اُس سے کسی مرد کا واسطہ پڑ جائے تو اُس کی رہائی مشکل ہو جاتی ہے۔ فقط ایک النا صر ہی تھا۔ جو چند ماہ اُس کے سامنے گذار کر ڈیرہ دمن بھاگ گیا۔ ورنہ ایک روز اُس کی انتڑیاں بالکل جواب دے دیتیں اور اُس کی قبر بدنی کے قبرستان میں بنی ہوتی۔ جس کے کتبے پر کچھ اس قسم کا شعر مرقوم ہوتا ؎

لحد پہ مری وہ پردہ پوش آتے ہیں
چراغِ گورِ غریباں، صبا، بجھا دینا

ہاں تو معاملہ بہت نزاکت اختیار کر گیا تھا۔ اس لئے کہ نذیر کے دل

میں شکوک پیدا ہو رہے تھے۔ وہ سوچتا تھا۔ یہ میرا بھانجا، اتنی اتنی دیر کہاں
غائب رہتا ہے۔ جب وہ اس سے پوچھتا تو وہ کوئی بہانہ پیش کر دیتا۔
مگر یہ بہانے کب تک چلتے۔ ان کا اسٹاک ایک روز ختم ہونا ہی تھا۔

نذیر کے دل میں ستارہ کے لئے اب کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ ایسا آدمی نہیں کہ اپنا فیصلہ تبدیل کر دے۔ اس کو ستارہ کی نہیں آصف کی فکر تھی۔ اپنے بھانجے کی جس کو وہ اپنا عزیز سمجھتا تھا۔ اور جس کو اس نے صرف اس غرض سے اپنے پاس رکھا تھا کہ وہ کچھ بن جائے۔

البتہ اس کو فکر تھی۔ کہ وہ کہیں اس عورت کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ وہ اس عورت کے ساتھ کئی برس گذار چکا تھا۔ اس کی رگ رگ اور نس نس سے واقف تھا اس کو معلوم تھا کہ آصف جیسے نوجوان اس کا من بھاتا کھاجا ہیں۔ اور ان کو اپنے دام میں پھنسانا اس ایسی تجربہ کار عورت کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لطف کی بات تو یہ ہے۔ کہ وہ خود بخود اس کے دام کے نیچے آ جاتے تھے۔ ایک بار پھنس جاتے تو پھر رہائی مشکل ہو جاتی تھی۔

ستارہ سے کسی مرد کا سابقہ پڑ جائے اور اتفاق سے وہ ستارہ کو پسند آ جائے تو پھر دن اور رات کا بیشتر حصہ اسی کے ساتھ کاٹنا پڑتا ہے۔ نذیر کو آصف کی پے در پے غیر حاضریوں ہی سے پتہ چل گیا تھا۔ مگر جب آصف کہتا کہ ماموں جان! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں اس کے متعلق

تو سوچ بھی نہیں سکتا، تو وہ شش و پنج میں پڑ جاتا۔ لیکن دل میں اُسے پورا یقین تھا کہ یہ لونڈا پھنس چکا ہے۔ اور جھوٹ بول رہا ہے۔

آصف واقعی جھوٹ بول رہا تھا۔ معاملہ اگر کسی اور عورت کا ہوتا تو وہ یقیناً کبھی جھوٹ نہ بولتا۔ مگر ستارہ اُس کے ماموں کی داشتہ تھی۔ اُس کے ساتھ وہ ایسے تعلقات قائم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تعلقات جو قائم ہو چکے تھے۔

پیچھے ہٹنا اور فرار اب بہت مشکل تھا۔ آصف اِس زنانی "تسمہ پا" کی گرفت میں تھا۔ بھاگ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر اُدھر نذیر کی آنکھوں میں برابر خون اُتر رہا تھا۔ اُس کو بس ایک موقع چاہیئے تھا۔ ایسا موقع کہ وہ سب کچھ خود اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

ایک روز نذیر نے وہ سب کچھ دیکھ بھی لیا جو وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ میرا حافظہ ساتھ نہیں دیتا۔ مجھے سارے واقعات اچھی طرح معلوم تھے۔ مگر اب اتنا عرصہ گذر گیا ہے۔ کہ بہت سی باتیں ذہن سے اُتر گئی ہیں۔ وہ خون جو نذیر کی آنکھوں میں ایک عرصے سے اُتر رہا تھا۔ وہ اُس وقت پی گیا اور اُن دونوں پر ٹوٹ پڑا۔

آصف نے اپنے ماموں کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ دونوں بے گناہ ہیں۔ اُن کے درمیان ایسا کوئی رشتہ، ایسا کوئی

تعلق نہیں جس کے لئے انہیں موردِ عتاب بنایا جائے۔ لیکن نذیر اُس وقت کچھ بھی سُننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ مار مار کے اُن دونوں کی ہڈی پسلیاں توڑ دینا چاہتا ہے تاکہ سارا قصّہ ہی ختم ہو۔ مگر مجید (مشہور ایکٹر جو اب پاکستان میں ہے۔) نے بڑی ہوشیاری سے بیچ بچاؤ کر دیا۔

نذیر مان گیا۔ وہ بہت کم کسی کی مانا کرتا ہے مگر اُن دنوں مجید انگیزی عادت کے مطابق اُس کی "اچھی کتابوں میں تھا"

مجید کو آصف اور ستارہ کے معاشقے کا علم تھا۔ سُنا ہے کہ اُس نے آصف کو کئی بار متنبہ کیا تھا کہ وہ اس خطرناک کھیل سے باز آجائے۔ مگر جوانی کے وہ دیوانے دن جن میں سے آصف کی زندگی گذر رہی تھی۔ نہ مانے اور نتیجہ اس کا یہ ہُوا کہ وہ راز جن کو وہ اپنی دانست کے مطابق پردے دبیز پردوں کے اندر چھپائے بیٹھے تھے۔ فاش ہو گیا۔

نذیر جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں بہت سخت گیر آدمی ہے۔ مگر ایسے بہت کم آدمی ہیں۔ جن کو معلوم ہے کہ وہ نرم دل بھی ہے۔ جو کام وہ خود کرتا ہے۔ اُس کی اچھائی بُرائی کا شعور رکھتا ہے۔ جو اوسط درجے کا آدمی نہیں رکھتا۔ وہ ستارہ سے ایک عرصے تک جسمانی طور پر وابستہ رہا۔ لیکن وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ یہ وابستگی آصف کی ستارہ سے بھی ہو۔

آصف اُس کا بھانجا تھا۔ کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ اسی رشتے کی بنا پر آصف اور ستارہ کا ملاپ پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر میں جو نذیر کے کردار کے تمام ٹیڑھے ترچھے زاویوں سے واقف ہوں، وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر آصف کے بجائے کوئی اور آدمی ہوتا۔ تو وہ اُس سے بھی یہی کہتا کہ دیکھو، اس عورت سے بچو۔ ایک صرف میں ہی تھا۔ جسے اپنی توانائی اور قوت پر ناز تھا لیکن میں بھی ہار گیا۔

نذیر خلوص کا پتلا ہے۔ ایک ایسے خلوص کا جو ہر وقت بڑا درشت اور کھردرا لباس پہنے رہتا ہے۔

نذیر نے تجیبہ کے کہنے پر ستارہ اور آصف دونوں کو چھوڑ دیا۔ اس لئے بھی کہ آصف نے اپنے ماموں کو یقین دلایا تھا۔ کہ اُن دونوں کے تعلقات بالکل پاک اور صاف ہیں۔

نذیر چلا گیا۔ مگر وہ مطمئن نہیں تھا۔ بظاہر وہ ایک اکھڑ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ شئے لطیف سے کورا، مگر وہ دوسروں کے دل کی گہرائیوں میں ایک ماہر غوطہ زن کی طرح اُتر سکتا ہے۔ اور پھر وہ ستارہ کی ایک ایک رگ سے واقف تھا۔ اور جس عمر سے آصف گزر رہا تھا۔ اُس میں تو وہ چھلانگیں لگاتا گزر چکا تھا۔ اس نے ایسی کئی منزلیں دیکھی تھیں جو آصف شاید ساری عمر میں بھی نہ دیکھ سکے ـــــ وہ مطمئن نہیں تھا۔

اس حادثے کے بعد آصف اور ستارہ کے درمیان کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ وعدے وعید ہوئے۔ قسمیں کھائی گئیں کہ وہ کبھی ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد آصف نے سچے عاشقوں کے انداز میں ستارہ سے رخصت لی اور چلا گیا۔

ستارہ نے اپنا میک اَپ درُست کیا۔ نئے کپڑے پہنے اور ٹیکسی منگوا کر بی۔ این ارودہ کے پاس چلی گئی، جس کی صحت دہلی کے حکیموں کے علاج سے اب کسی قدر بحال ہو چکی تھی۔ اور اُس کے پچکے ہوئے گالوں میں تھوڑا سا گوشت آ گیا تھا۔

الناصر بھی تھا۔ ڈاکٹر محبوب بھی تھے۔ اور خدا معلوم اور کتنے تھے آصف گر ایک بہت ہی کڑے مرحلے سے گذر چکا تھا۔ مگر اُس نے ستارہ کے یہاں اپنی آمد و رفت یکسر منقطع نہ کی۔ اور وہ کر بھی کیسے سکتا تھا جبکہ پُرانی جادوگرنیوں کی طرح اس جادوگرنی نے آصف کو ایک مکھی بنا کر اپنی دیوار کے ساتھ چپکا رکھا تھا۔ اب صرف نجات کا ایک ہی رستہ تھا کہ پُرانی کہانیوں کا کوئی شہزادہ سلیمانی تعویذ کے ذریعے سے اُس جادوگرنی کا مقابلہ کرتا اور انجام کار آصف اُس کے چنگل سے نکلتا۔

میں جانتا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ طاقتور سے طاقتور سلیمانی تعویذ بھی ستارہ پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک ایسا حصار ہے جسے

لندھور بھی سر نہیں کر سکتا۔

یہ چکر یونہی چلتا رہا۔ نذیر اور آصف کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔

ہاں میں ایک بات کہنا بھول ہی گیا۔ جب نذیر نے ستارہ کا بستر گول کیا تھا۔ تو رفیق غزنوی مشہور موسیقار نے مفاہمت کی کوشش کی۔ اُس نے ستارہ، اور دُرّہ اور نذیر کو اپنے یہاں بلایا۔ شراب کے دور چلے۔ رفیق نے جو گفتار کا غازی ہے بڑے فلسفیانہ انداز میں کئی پگ شراب کے علاوہ پلائے۔ مگر کوئی صورت پیدا نہ ہوئی اور جب کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو خود بخود ایک صورت پیدا ہو گئی۔ رات بھر ستارہ رفیق کے فلیٹ میں رہی اور وہ اُس کو سمجھاتا رہا کہ اب کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔

عجیب بات ہے کہ رفیق نے پھر مفاہمت کی کوشش نہ کی اور نہ ستارہ اُس کے یہاں رات کو یہ سننے کے لئے گئی کہ اب کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ شاید اس لئے کہ ستارہ کے کسی توڑے میں رفیق کو ایک دو ماترے کم محسوس ہوئے ہوں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ ستارہ نے یہ محسوس کیا ہو کہ رفیق سُر سے ایک آدھ سُوتر اُوپر یا نیچے گاتا ہے...... اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اب ہم پھر ستارہ، اور آصف کی طرف پلٹتے ہیں۔ ستارہ اُس پر بہت

بڑی طرح لٹو تھی۔ کہ وہ نوجوان خامکار تھا۔ اُس کی زندگی میں ستارہ شاید سب سے پہلی عورت تھی۔

کہا جاتا ہے کہ نذیر نے ایک بار پھر چھاپہ مارا اور دونوں کو عین موقع پر جا پکڑا۔ اس دفعہ کس نے بیچ بچاؤ کیا۔ اس کا مجھے علم نہیں۔ بہرحال معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ کیونکہ آصف نے اپنے ماموں کو یقین دلا دیا کہ اُس کے اور ستارہ کے درمیان ایسی ویسی کوئی بات نہیں، بہرحال آصف اور ستارہ کے سر سے آئی بلا ایک دفعہ پھر ٹل گئی مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن آصف غائب ہو گیا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ ستارہ بھی غائب ہے۔ آخر کار یہ معلوم ہوا کہ وہ کسی تیرتھ کی یاترا کرنے گئی ہے۔ اگر موسم حج کا ہوتا تو یار لوگ یقیناً اُڑا دیتے کہ حضرت آصف حج کرنے گئے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں وہ دونوں کہاں گئے تھے۔ مگر دہلی سے خبر موصول ہوئی کہ ستارہ مشرف با اسلام ہو چکی ہے۔ اور اُس کا اسلامی نام القاہ رکھی رکھا گیا ہے۔ اور یہ کہ آصف نے اُس سے باقاعدہ نکاح پڑھوالیا ہے۔

اُس کے ماموں نذیر پر اس کا کیا ردِعمل ہوا اُس کے متعلق آپ خود سوچ سکتے ہیں۔ مگر پُر لطف بات یہ ہے۔ کہ ہندوؤں کے قانون کے مطابق طلاق ہو ہی نہیں سکتی۔ عورت ایک دفعہ کسی مرد سے وابستہ ہو جائے۔ تو سو حیلے کرنے پر بھی خود کو اپنے پتی سے جدا نہیں کر سکتی۔ یوں وہ آوارہ گردی

کر سکتی ہے۔ سینکڑوں مردوں کی آغوش کی زینت بن سکتی ہے مگر رہے گی اپنے پتی کی پتنی۔ اور یہ بھی ہے۔ کہ ہندو عورت چاہے دوسرا مذہب اختیار کر لے مگر اس کی اصل پوزیشن میں فرق نہیں آسکتا۔ اس لحاظ سے گو ستارہ اللہ رکھی بن کر بیگم کے آصف ہو گئی تھی مگر قانون کی نظروں میں وہ مسز ڈیسائی تھی۔ اس بیمار صورت ڈیسائی کی بیوی جو روٹی کمانے کے لئے بہت بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

جب اس خبر کی تصدیق ہو گئی تو میں نے مصوّر کے کالموں میں جی بھر کے لکھا۔ قریب قریب ہر ہفتے اس نئے بیاہتا جوڑے کا ذکر ہوتا تھا۔ بڑے طنز یہ اور فکاہیہ انداز میں۔

ماہِ عسل یعنی ہنی مون منانے کے بعد جب یہ جوڑا بمبئی واپس آیا تو نذیر خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔ ایک دفعہ مجھے ریس کورس جانے کا اتفاق ہوا، میں نے دیکھا کہ ہجوم میں سے آصف شارک سکن کے بے داغ سوٹ میں ملبوس، پھرتیلی ستارہ کی کمر میں ہاتھ دیئے چلا آرہا ہے۔ جب وہ میرے قریب پہنچا۔ تو وہ پہلے مسکرایا، پھر ہنسنے لگا۔ اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا "بھئی خوب ——— بہت خوب۔ نمک مرچ اور بال کی کھال کے کالموں میں تم جو لکھ رہے ہو، خدا کی قسم لاجواب ہے"۔

ستارہ تیوری چڑھا کر ایک طرف ہٹ گئی مگر آصف نے اس

طرف کوئی توجہ نہ کی اور مجھ سے بڑے بلند بانگ خلوص کے ساتھ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ وہ بڑے ظرف کا آدمی ہے۔ اور ان پڑھ ہونے کے باوجود مزاح اور مذاق سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اب بمبئی میں ہر شخص کو جسے فلمی صنعت سے دلچسپی تھی، معلوم ہو چکا تھا۔ کہ کوئی آصف ہے، جس سے ستارہ نے شادی کر لی ہے۔ بھنڈی بازار اور محمد علی روڈ کے ایرانی ہوٹلوں میں پنجاب اور یو۔پی کے مسلمان جو مسلم لیگ کی حمایت میں تھے۔ چائے کی پیالیاں سامنے رکھ کر اپنی بے پناہ مسرت کا اظہار کرتے تھے۔ کہ میاں بھائی (مسلمان) نے ایک کافر عورت کو مسلمان کر کے اپنے عقد میں لے لیا۔

بعض کہتے تھے۔ کہ آصف کو اب اس سالی سے ایکٹنگ نہیں کرانی چاہیئے۔

بعض کہتے تھے۔ کوئی واندہ (حرج) نہیں مگر جب باہر نکلے تو پردہ ضرور کیا کرے۔

بعض کہتے تھے ہٹاؤ یار — یہ سب اسٹنٹ ہے۔

بہر حال جہاں تک میں سمجھتا ہوں، آصف، ستارہ سے قانونی طور پر شادی کر چکا تھا، مگر ایک عرصے کے بعد جب میں نے اس سے پوچھا کیوں

دھانسو کیا واقعی ستارہ تمہاری منکوحہ بیوی ہے" تو وہ ہنسا، "کیسا نکاح اور کیسی شادی"۔

اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ اصل معاملہ کیا تھا اور کیا ہے۔

آصف کا اپنا مکان کوئی بھی نہیں تھا۔ بس دونوں وہیں خداداد سرکل (دادر) میں رہتے تھے۔ اور کھلے بندوں رہتے تھے۔ ستارہ کی موٹر نئی! اس میں گھومتے تھے۔

میرا خیال ہے۔ دہلی میں آصف نے شاید لالہ جگت نرائن کو اس بات پر آمادہ کر لیا تھا۔ کہ وہ اُسے ایک فلم بنانے کا سرمایہ دے۔ اُس سے شاید اُس نے کچھ ایڈوانس بھی لیا ہوگا۔ جبھی تو وہ تنگدست نہیں تھا۔

آصف میں ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ کہ خود اعتماد ہے۔ اُس کے اندر احساس کمتری کا شائبہ تک موجود نہیں۔ وہ بڑے بڑے ڈائرکٹروں اور سٹوری رائٹروں کے چھکے چھڑا دیتا ہے۔ محض اپنی خداداد قابلیت کی بدولت۔ اس خداداد قابلیت کو میں ہاؤس سنس، کہا کرتا تھا۔ آصف کے سامنے بھی۔ مگر اُس نے کبھی بُرا نہ مانا۔

آصف جب ڈائرکٹر بنا تو دوسرے تنگ خیال اور کم ظرف ڈائرکٹروں کے مانند اُس نے اپنا حلقۂ فکر و نظر محدود نہ رکھا۔ اُس نے ہر دماغ کو دعوت دی کہ وہ کوئی اچھی چیز پیش کرے اسے وہ بخوشی قبول کرے گا۔

میں خدا معلوم کہاں کا کہاں چلا گیا ہوں مگر یہاں مجھے ایک لطیفے کا ذکر کرنا اس لئے دلچسپ معلوم ہوتا ہے کہ میری ذات سے متعلق ہے۔

آصف اُن دنوں "پھول" بنا رہا تھا۔ میں اپنے فلیٹ واقع کلیئر روڈ میں تھا کہ نیچے سے موٹر کے ہارن کی تابڑ توڑ آوازیں آئیں۔ میں نے باہر بالکنی میں نکل کر دیکھا۔ ایک بہت بڑی موٹر نیچے کھڑی تھی جب میں جنگلے پر جھکا تو پچھلی سیٹ سے آصف نے کھڑکی میں سے اپنا وزنی سر باہر نکالا اور مسکرایا۔

میں نے اُس سے کہا "آؤ، کیا بات ہے؟"

اُس نے دروازہ کھولا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی ستارہ سے کچھ کہا، اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا "آتا ہوں اور بتاتا ہوں"

لمبی چوڑی موٹر کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ چشم زدن میں اڈلفی چیمبرز کے احاطے سے باہر نکل گئی۔ آصف نے سیڑھیوں کا رُخ کیا۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ ایک منٹ میں آصف اندر داخل ہوا اور بڑے پُرجوش انداز میں مجھ سے ہاتھ ملا کر کہنے لگا "میں تمھیں اپنی کہانی سنانے آیا ہوں۔"

میں نے ازراہِ مذاق کہا "تمہیں معلوم ہے۔ میں فیس لیا کرتا ہوں۔"

آصف نے کچھ نہ کہا، مجھ سے ہاتھ ملایا اور اُلٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ میں نے اُس کو آوازیں دیں۔ اُس کے پیچھے دوڑا گیا مگر اُس نے میری

ایک نہ سُنی۔ بس اتنا کہا کہ وہ فیس لے کر آئے گا۔ تو کہانی سنائے گا۔ ورنہ نہیں۔

میں بہت پشیمان ہوا کہ میں نے اُس سے ایسا مذاق کیا۔۔۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ میری اس بات کو اُسی رنگ میں لے گا جس رنگ میں وہ کہی گئی تھی مگر معاملہ اس کے برعکس نکلا اور وہ چلا گیا۔

میں اُدھر آیا اور اپنی بیوی سے سارا قصہ بیان کیا۔ تو اُس نے صاف لفظوں میں کہا کہ یہ میری عین حماقت تھی۔ اس لئے کہ احسن میرا بے تکلف دوست نہیں تھا۔ اور یہ واقعہ ہے۔ کہ اُس کے اور میرے مراسم کچھ زیادہ نہیں تھے۔ چونکہ وہ اور میں طبعاً صاف گو۔ دل شکن حد تک صاف گو ہیں۔ اس لئے میں نے جب اُن سے فیس کا مذاق کیا تھا۔ تو میرے دل دماغ میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے مجھے اُس کے جذبات مجروح کرنا مطلوب تھے۔ اور نہ میں ایسا بنیا ہوں کہ اُس سے پہلے ہی روپے کا تقاضا کرتا۔ مجھے تو صرف کہانی سُننا تھی۔ اور بس۔

اور میں کئی ڈائرکٹروں سے اُن کی تھرڈ کلاس کہانیاں ایک نہیں چار چار مرتبہ سن چکا تھا۔ کیونکہ وہ میری رائے کے طالب ہوتے تھے۔ میں نے اُن سے کبھی اپنے وقت کی (جو کہ ظاہر ہے ضائع ہوتا تھا) قیمت طلب نہیں کی تھی۔

مجھے افسوس تھا۔ کہ میں نے آصف کو ناراض کیا۔ میں اُس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا۔ کہ دروازے پر دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا۔ ایک آدمی کھڑا تھا۔ اُس نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں دیا اور چلا گیا۔ میں ابھی لفافہ کھول ہی رہا تھا۔ کہ نیچے سے ہارن کی آواز آئی۔ میں نے بالکنی میں جا کر دیکھا۔ ستارہ کی کار تھی۔ اور وہ اڈلفی چیمبرز کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔

لفافہ کھول کر میں نے دیکھا۔ کہ سو سو کے پانچ نوٹ ہیں۔ ان کے ساتھ ایک مختصر سی تحریر تھی: "فیس حاضر ہے۔ اب میں کل آؤں گا"

میں بھونچکا ہو کے رہ گیا۔

دوسرے روز صبح نو بجے کے قریب وہ اُسی کار میں آیا۔ ستارہ ساتھ تھی، مگر وہ اُوپر نہ آئی۔ آصف کو دستک دینے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، اس لئے کہ دروازہ کھلا تھا۔ اور میں اُس کے استقبال کے لئے دہلیز میں کھڑا تھا۔

اُس نے مجھے دیکھتے ہی کہا "کیوں ڈاکٹر صاحب فیس مل گئی آپ کو؟" میں بہت شرمندہ ہوا۔ جس کا اظہار میں نے بڑے پُر خلوص اور موزوں و مناسب الفاظ میں کیا۔ اور وہ پانچسو اُس کو واپس کرنا چاہے۔

آصف اپنے مخصوص انداز میں ہنسا اور صوفے پر اپنی نشست جما کر

کہنے لگا یہ منٹو صاحب۔ آپ کس خیال میں ہیں۔ یہ پیسہ میرا ہے۔ میرے باپ کا۔ پروڈیوسر کا ہے۔ غلطی میری تھی۔ جو میں بغیر فیس کے چلا آیا حالانکہ میری نیت واللہ ہرگز یہ نہیں تھی۔ کہ مفت میں کام کرایا جائے۔ آپ کا وقت یقیناً ضائع ہوگا۔ اور اس کی قیمت بھی۔ خدا کی قسم آپ کو ضرور ملنی چاہیئے۔ لیکن اب چھوڑیئے اس کو اس کو اور کہانی سنیئے۔"

اس نے مجھے کچھ اور کہنے کی مہلت نہ دی۔ وہ بڑے صوفے پر تھا میں اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ آصف کو میں نے کبھی کہانی سنانے یا سننے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اپنی بوسکی کی قمیص کی آستینیں اوپر چڑھائیں۔ پتلون کے اوپر کے بٹن جو پیٹی کا کام دیتے ہیں کھولے اور صوفے پر ایک آسن جما کر کہانی سنانے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ "ہاں تو کہانی سنیئے۔ عنوان ہے 'پھول'۔ کیا خیال ہے آپ کا عنوان کے متعلق؟"

میں نے کہا "اچھا ہے۔"

"شکریہ — اب آپ سنیئے — میں آپ کو منظر بہ منظر سناتا ہوں۔"

اور اس نے اپنی کہانی جو خدا معلوم کس کی لکھی تھی۔ اپنے مخصوص انداز میں سنانا شروع کی۔ یہ مخصوص انداز کچھ اس قسم کا ہے کہ کہانی سنانے کے دوران میں وہ مداری بن کرتا ہے یعنی حسب ضرورت واقعات کے

اُتار چڑھاؤ کے ساتھ خود بھی اُترتا چڑھتا رہتا ہے۔ ابھی وہ صوفے پر ہے۔ چند لمحات کے بعد اُس کی پُشت کی دیوار پر دوسرے لمحے اُس کا سر نیچے ہے اور ٹانگیں اُوپر اور دھم سے نیچے فرش پر۔ اس کے فوراً بعد کرسی پر اکڑوں بیٹھا ہے۔ مگر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ الیکشن میں کوئی آدمی ووٹ حاصل کرنے کے لئے تقریر کر رہا ہے۔

کہانی ختم ہوئی —— بڑی لمبی کہانی شیطان کی آنت کی طرح۔

چند لمحات خاموشی میں گذر گئے۔ اس کے بعد آصف نے مجھ سے پوچھا "کیا خیال ہے۔ آپ کا کہانی کے متعلق۔"

میرے منہ سے یہ الفاظ خود بخود نکل گئے "یہ بکواس ہے!"

آصف نے زور زور سے اپنے ہونٹ کاٹے اور پھر کھلا کر صوفے کی کی پُشت کی دیوار پر بیٹھ گیا اور غضب ناک لہجے میں پوچھا "کیا کہا؟"

کوئی اور ہوتا تو بہت ممکن ہے لڑکھڑا جاتا مگر میں ہمیشہ ایسے معاملوں میں ثابت قدم رہا ہوں۔ چنانچہ میں نے اور زیادہ مضبوطی سے کہا۔ "میں نے کہا تھا بکواس ہے۔"

آصف نے اپنے مداری پن سے مجھے متاثر کرنے کی بہت کوشش کی۔ مجھے فضول کی جھک جھک پسند نہیں تھی۔ وہ بہت اُونچے سُروں میں بولتا تھا۔ میں نے سوچا، اس کا علاج یہی ہے۔ کہ ایک دفعہ میں بھی اپنے

حلق کر مٹی چھٹی دے دوں۔ چنانچہ میں نے اُس سے کہا "سُنیئے آصف صاحب۔ آپ ایک بہت وزنی پتھر منگوا لیجیے۔ اُس کو میرے سر پر رکھیے اور اُس پر وزنی ہتھوڑے ماریئے۔ خدا کی قسم میں پھر بھی کہوں گا۔ کہ آپ کی یہ کہانی بکواس ہے۔"

یہ سب کچھ میں نے بہت اُونچے سُروں میں کہا تھا۔ آصف صوفے کی پشت کی دیوار پر سے نیچے اتر آیا۔ آگے بڑھ کر اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اپنے ہونٹ چوستے ہوئے کہا "خدا کی قسم بالکل بکواس ہے۔ میں تم سے یہی سُننے آیا تھا۔"

میں سمجھا شاید مذاق کر رہا ہے۔ لیکن چند لمحات کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ قطعاً سنجیدہ تھا۔ چنانچہ ہم کہانی میں ترمیم و اصلاح کے متعلق سوچنے لگے۔

لطیفہ ختم ہوا۔ یہ میری ذات سے یقیناً متعلق ہے۔ مگر اس کے بیان سے مقصود صرف یہ تھا۔ کہ آپ کو آصف اور ستارہ کے کردار کا تقابل نظر آجائے۔

ایک زمانہ گزر گیا۔ آصف اور ستارہ میاں بیوی کی زندگی گزار رہے تھے مگر یہاں مجھے ایک اور لطیفہ یاد آگیا۔

جس زمانے میں آصف سے میری دوستی نہیں تھی۔ اور نہ اس کا تعلق ابھی ستارہ کے ساتھ قائم نہیں ہوا تھا۔

کے آصف صاحب کے چہرے پہ بلا مبالغہ دس ہزار کیلیں تھیں اور اتنے ہی مہاسے تھے۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ یہ جوانی کی نشانیاں ہیں میں سوچتا تھا۔ اگر جوانی کی نشانیاں اتنی بدنما اور تکلیف دہ ہیں تو خدا کرے کسی پہ جوانی نہ آئے (مجھ پہ اللہ کا شکر ہے۔ کبھی آئی ہی نہیں۔)

میں جب اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا جو کہ بلا مبالغہ خانۂ زنبور دکھائی دیتا تھا۔ تو مجھے بڑی کوفت ہوتی۔ میں نیم حکیم بھی ہوں۔ اپنی دانست کے مطابق اور اپنے ڈاکٹر دوستوں سے مشورہ کر کے میں نے کئی دوائیں تجویز کر اُس کو دیں مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کیلیں اُسی طرح موجود تھیں۔ مگر جب ستارہ اُس کی زندگی میں آئی تو چند مہینوں کے اندر اندر اُس کا چہرہ بالکل صاف ہو گیا۔ صرف نشان باقی رہ گئے تھے۔

ایک اور لطیفہ سُن لیجئے :۔ بمبئے ٹاکیز میں کمال امروہوی اور میں دونوں اکٹھے کام کر رہے تھے۔ اُس کی کہانی "محل" کو فلم کے لئے موزوں و مناسب شکل دینے کے لئے سوچ بچار ہو رہی تھی۔ اس دوران میں کمال کے داہنے گال پہ ایک چھوٹی سی پھنسی نمودار ہوئی جو اس کو بہت تکلیف دینے لگی۔ اُس نے اس تکلیف کا ذکر مجھ سے کیا۔ میں نے اُس سے کہا۔ "ایک بڑا سہل علاج ہے۔ اور تیر بہدف"

اُس نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا؟"

"میں نے اُس سے کہا تم ستارہ کا گھر جانتے ہو نا؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں!"

تو ایسا کرو۔ اُس کی سیڑھیوں کا ایک چکر لگا آؤ ـــــ مگر دیکھو اندر نہیں جانا۔"

کمال ذہین آدمی ہے۔ میرا مطلب سمجھ گیا اور بہت دیر تک ہنستا رہا۔ لطیفے ختم ہوئے۔

بہت دیر تک ستارہ اور آصف اکٹھے ازدواجی زندگی بسر کرتے رہے۔ اب دونوں غالباً ماہم کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے ـــــ ہاں وہیں رہتے تھے۔ کیونکہ وہاں میرا کئی مرتبہ آنا جانا ہوا۔ لیڈی جمشید جی روڈ کے چرچ کے سامنے ایک گلی تھی جس کے آخری سرے پہ ایک تین منزلہ بلڈنگ۔ غالباً تیسری منزل پر ستارہ کا فلیٹ تھا۔

مجھے یہاں جانے کا کئی بار اتفاق ہوا تھا۔ اُن دنوں آصف "پھول" بنانے کے بعد غالباً "انارکلی" بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی کہانی کمال امروہی نے لکھی تھی۔ مگر وہ شاید اُس سے مطمئن نہیں تھا۔ کیونکہ وہ کئی آدمیوں کو دعوت دے چکا تھا۔ کہ وہ اُس میں کچھ جدت پیدا کریں میں بھی، ان ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔

میں عام طور پر صبح آٹھ بجے کے قریب وہاں پہنچتا۔ دروازہ ایک

بڑھیا کھولتی۔ جو ململ کی باریک ساڑھی پہنے ہوتی۔ اسے دیکھ کر مجھے سخت کوفت ہوتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ دروازہ الف لیلیٰ کی کسی کٹنی نے کھولا ہے۔

میں اندر جاتا اور صوفے پہ بیٹھ جاتا۔ ساتھ والے کمرے سے جو غالباً خوابگاہ تھی۔ ایسی ایسی آوازیں آتیں کہ روح لرز لرز جاتی۔ تھوڑی دیر کے بعد آصف نمودار ہوتا۔ حسب عادت اپنے ہونٹ چاٹتے ہوئے۔ اُسکی ہیئت کذائی دیکھنے کی چیز تھی۔ ململ کا کُرتہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے۔ گردن اور سینے پر نیل پڑے ہیں۔ بال پریشان ہیں۔ سانس پھُولی ہوئی ہے۔ معمولی علیک سلیک ہوتی۔ اور وہ فرش پہ ڈھیر ہو جاتا۔ تھوڑی دیر کے بعد ستارہ، آصف کے لئے ایک پیالہ بھیجتی۔ جس میں معلوم نہیں کس چیز کی کھیر ہوتی۔ آصف آہستہ آہستہ بادل نخواستہ پیالہ ختم کرتا۔ اس کے بعد ہم اپنا کام شروع کر دیتے۔ جو زیادہ تر گپوں پر مشتمل ہوتا۔

کافی عرصہ گذر گیا۔ ستارہ اور آصف کے تعلقات بڑے مستحکم نظر آتے تھے۔ مگر ایک دم جانے کیا ہوا کہ یہ سننے میں آیا کہ آصف اپنے عزیزوں میں کسی لڑکی سے شادی کر رہا ہے۔ تاریخ پکی ہو گئی۔ اور وہ عنقریب اپنے دوستوں کے ساتھ لاہور روانہ ہونے والا ہے۔

میں اُن دنوں بہت مصروف تھا۔ ورنہ اُس سے مل کر ضرور دریافت

کرنا کہ یہ کیا قصّہ ہے۔ لیکن مجھے اس کا موقع نہ ملا۔ لیکن ایک روز اُس سے سرِراہ ملاقات ہو گئی۔ میں نے سرسری طور پر اُس سے پوچھا تو اُس نے صرف اتنا کہا: "میں نے وہ قصّہ ختم کر دینے کی ٹھان لی تھی۔ چنانچہ ہو جائے گا۔"

وہ کار میں تھا۔ میں پیدل تھا۔ اور اُس کو عجلت بھی تھی۔ اس لئے زیادہ باتیں نہ ہو سکیں۔ چند روز کے بعد معلوم ہُوا کہ آصف ایک بہت بڑی پارٹی کے ساتھ روانہ ہو گیا ہے۔ اس کے بعد یہ اطلاع ملی کہ لاہور میں اُس کی شادی بڑے ٹھاٹ سے ہوئی۔ خُم کے خُم لنڈھائے گئے۔ مجرے ہوئے اور راگ رنگ کی کئی محفلیں جمیں۔ پھر سُنا کہ آصف اپنی نئی نویلی دُلہن کے ساتھ بمبئی پہنچ چکا ہے۔ اور پالی ہل باندرہ میں اُس نے ایک کوٹھی کا نصف حصّہ کرائے پر اُٹھا لیا ہے۔ لیکن بعد میں معلوم ہُوا کہ پوری کوٹھی نذیر کے پاس تھی۔ جس نے آدھی اپنے بھانجے کو دے دی۔

یہ بڑا خوشگوار انقلاب تھا۔ مجھے معلوم نہیں ستارہ کا ردِ عمل کیا تھا۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ ابدڈہ کے ہاں وہ اکثر جایا کرتی تھی اور وہ بھی اُس کے ہاں اکثر آیا کرتا تھا۔

اُن دنوں آصف پالی ہل پر رہتا تھا۔ نئی نویلی دلہن پاس تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اُن دنوں مغلِ اعظم کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس

کی کہانی کمال حیدر امروہی نے لکھی تھی۔ مگر آصف اُس سے مطمئن نہیں تھا۔ اُس نے کئی انشاپردازوں سے مشورہ لیا تھا مگر وہ پھر بھی مطمئن نہیں تھا۔

اس ضمن میں آپ کو کئی لطیفے سُنا سکتا ہوں مگر اُن سے کوئی مطلب حل نہیں ہوگا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ آصف اور اُس کی نئی نویلی بیوی — سنہرے جلوؤں کی بیاہی۔ چند روز اکٹھے رہے۔ اس کے بعد یہ دیکھنے میں آیا کہ آصف صاحب گھر سے غائب ہیں اور راتیں ستارہ کے ساتھ گزارتے ہیں۔

یہ شادی زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ نذیر کا نوجوان لڑکا بھی وہیں تھا۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ آصف نے اپنی بیوی کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ ناچاقی ہوئی۔ اس کے بعد پتہ چلا کہ طلاق ہونے والی ہے۔ اور اس دوران میں آصف برابر ستارہ کے یہاں جاتا تھا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ستارہ کاریگر ہے۔ اس کا مقابلہ نئی نویلی دلہن نہیں کر سکتی۔ چنانچہ چند مہینوں کے بعد آصف کی دلہن اپنے گھر واپس چلی گئی اور بعد میں معلوم ہوا کہ طلاق ہو گئی ہے۔

اب پھر آصف اور ستارہ اکٹھے تھے۔ آصف کی بیاہتا بیوی کے متعلق کئی افسانے مشہور ہیں۔ مگر میں اُن کا ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ مجھے اُن کی صداقت کے متعلق اچھی طرح علم نہیں۔

میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ آصف نے بیاہ کیا۔ لاہور میں بڑے ٹھاٹ کی مجلسیں جمیں، اس کے بعد آصف اپنی بیوی کو لے کر بمبئی آیا۔ پالی ہل پر ٹھہرا اور دو تین مہینے کے اندر اندر اُس نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا ——— اس کی وجہ ستارہ کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی۔

ستارہ مردم شناس عورت ہے۔ اُس کو وہ تمام ڈھب آتے ہیں۔ جو مرد کو اپنی طرف راغب کر سکتے ہیں بلکہ یوں کہیئے کہ اُسے دوسری عورتوں کے لئے بالکل ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آصف نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا اور ستارہ کی آغوش میں چلا گیا۔ اس لئے کہ اس میں کشش تھی۔

آصف کی شادی اپنے خاندان میں ہوئی تھی۔ اس خاندان کے متعلق مختلف روایات مشہور ہیں۔ لیکن میں اُن کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا۔

آصف نے اپنی بیاہتا بیوی کو چھوڑ دیا۔ شاید اس لئے کہ اُس میں وہ خصوصیتیں موجود نہیں تھیں۔ جو ستارہ میں تھیں۔ شاید اس لئے کہ آصف کنواری لڑکی کا قائل نہیں تھا۔ بہر حال جو نتیجہ برآمد ہوا وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔

آصف کی نئی نویلی دُلہن چلی گئی اور آصف نے پھر سے ستارہ کے یہاں قیام شروع کر دیا۔ اس قیام کے دوران میں عجیب و غریب افواہیں منتشر

ہوئیں۔ مگر میں اُن کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

میں نے یہ مضمون لکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آصف مجھ سے ناراض نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ وہ بڑے ظرف کا آدمی ہے۔ ستارہ یقیناً ناراض ہوگی ــــ مگر وہ مجھے تھوڑی دیر کے بعد بخش دے گی۔ اس لئے کہ اُس کا ظرف بھی چھوٹا نہیں ہے۔ وہ بڑی قدآور عورت ہے۔ (حالانکہ اُس کا قد بہت پست ہے۔) ــــ وہ مجھے معلوم نہیں کیسا آدمی سمجھتی ہے مگر میں اُسے بحیثیت عورت کے ایسی عورت سمجھتا ہوں۔ جو سو سال میں شاید ایک مرتبہ پیدا ہوتی ہے۔

چراغِ حسن حسرت

مولانا چراغ حسن حسرت جنھیں میں اپنی اختصار پسندی کی وجہ سے حسرت صاحب کہتا ہوں، عجیب و غریب شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ پنجابی محاورے کے مطابق دودھ دیتے ہیں مگر مینگنیاں ڈال کر۔ ویسے یہ دودھ پلانے والے جانوروں کی قبیل سے نہیں ہیں، حالانکہ کافی بڑے بڑے کان رکھتے ہیں۔

آپ سے میری پہلی ملاقات عرب ہوٹل میں ہوئی۔ جسے اگر فرانس کا "لیٹن کوارٹر" کہا جائے، تو بالکل درست ہوگا۔ ان دنوں میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا اور خود کو بزعمِ خویش بہت بڑا ادیب سمجھنے لگا تھا۔

عرب ہوٹل میں میرا تعارف مظفر حسین شمیم نے اُن سے کرایا۔ یہ بھی

حسرت صاحب کے مقابلے میں کم عجیب و غریب شخصیت نہیں رکھتے۔ میں بیکار تھا۔ شمیم صاحب کی وساطت سے مجھے ہفتہ وار "پارس" میں جس کے مالک کرم چند تھے، ملازمت مل گئی۔ تنخواہ چالیس روپے ماہوار مقرر ہوئی مگر ایک مہینے میں بمشکل دس پندرہ روپے ملتے تھے۔ شمیم صاحب اور میں دونوں دوپہر کا کھانا عرب ہوٹل میں کھاتے تھے۔

ایک دن میں نے اس ہوٹل کے باہر تھڑے پر دو ٹوکرا دیکھا۔ جس میں بچا کھچا کھانا ڈال دیا جاتا تھا۔ اس کے پاس ایک کتا کھڑا تھا۔ ہڈیوں اور نرم نرم روٹیوں کو سونگھتا، مگر کھاتا نہیں تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ یہ سلسلہ کیا ہے۔

شمیم صاحب نے جب حسرت صاحب سے میرا تعارف کرایا اور ادھر اُدھر کی چند باتیں ہوئیں، تو میرے استفسار پر بتایا کہ اس کتے کی محبت ایک سانڈ سے ہے۔ مجھے بہت حیرت ہوئی، لیکن میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان دو حیوانوں میں دوستی تھی۔ سانڈ ساڑھے بارہ بجے دوپہر کو خراماں خراماں آتا۔ کتا دم ہلا ہلا کر اس کا استقبال کرتا اور وہ ٹوکرا جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ اس کے حوالے کر دیتا۔ جب وہ اپنا پیٹ بھر لیتا، تو جو کچھ باقی بچ جاتا اس پر قناعت کرتا۔

اس دن سے اب تک میری اور حسرت صاحب کی دوستی، اس

سانڈ اور کتے کی دوستی ہے۔ معلوم نہیں حسرت صاحب سانڈ ہیں اور میں کتا۔ مگر ایک بات ہے کہ ہم میں سے کوئی نہ کوئی سانڈ اور کتا ضرور ہے۔ لیکن ہم میں اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، جو ان دو جیوانوں میں شاید نہ ہوتی ہوں۔

حسرت صاحب بڑی پیاری شخصیت کے مالک ہیں۔ میں ان سے عمر میں کافی چھوٹا ہوں۔ لیکن میں انہیں بڑی بڑی مونچھوں والا بچہ سمجھتا ہوں —— یہ مونچھیں صلاح الدین احمد صاحب کی مونچھوں سے بہت ملتی جلتی ہیں۔

حسرت صاحب کہنے کو تو کشمیری ہیں، مگر اپنے رنگ اور خدوخال کے اعتبار سے معلوم نہیں کس نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ فربہ اندام اور خاصے کالے ہیں۔ معلوم نہیں کس اعتبار سے کشمیری ہونے کا دعوے کرتے ہیں؟

ویسے مجھے اتنا معلوم ہے کہ آپ آغا حشر کاشمیری کے ہم جلیس تھے علامہ اقبال سے بھی شرفِ ملاقات حاصل تھا۔ جو کشمیری تھے۔ خاکسار بھی ہے۔ جس سے ان کی "سانڈ اور کتے" کی دوستی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اگر یہ ثابت کرنا چاہیں کہ خالص کشمیری ہیں، تو کوئی کشمیری نہیں مانے گا۔ حالانکہ انھوں نے کشمیر پہ ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

یہ کتاب میں نے پڑھی ہے۔ میں عام طور پر بڑا برخود غلط انسان متصور کیا جاتا ہوں۔ لیکن مجھے ماننا پڑتا ہے ـــــ اور آپ سب کے سامنے کہ حسرت صاحب بڑی دلفریب اندازِ تحریر کے مختار اور مالک ہیں۔ بڑی سہل ممتنع قسم کے فقرے اور جملے لکھتے ہیں۔ پر ان کی ان پیاری تحریروں میں مجھے ایک بات کھٹکتی ہے کہ وہ ہمیشہ اُستادوں کا طریقہ تعلیم استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے بے شمار شاگرد موجود ہیں جو شاید ان کے علم میں نہ ہوں۔ مگر ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر بچے، نوجوان اور بڑے بوڑھے پر رعب جمائیں۔ اور اس کا کاندھا تھپکا کر اُسے یہ محسوس کرنے پر مجبور کریں کہ وہ ان کا برخوردار ہے ـــــ مجھے ان کی طبیعت کا یہ رُخ سخت ناپسند ہے، اسی وجہ سے میری اور ان کی لڑائی ہوتی رہی ہے۔

مجھے ان کا برخوردار ہونے میں کوئی عذر نہیں۔ میں آپ سب کے سامنے یہ اعتراف کرنے کے لئے تیار ہوں کہ میں صرف برخوردار ہی نہیں، برخر سوار بھی ہوں۔ لیکن وہ مجھ پر رُعب نہ ڈالا کریں۔ میں ان کی دل سے عزت کرتا ہوں جب سے "نوائے وقت" میں ان کے "حرف و حکایت" کا کالم چھپنا بند ہوا ہے۔ میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے مجھے صبح کی چائے نہیں ملی، جو میرے لئے بہت ضروری ہے۔

"حرف و حکایت" کا کالم میرا خیال ہے، انھوں نے "امروز" میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اس روزنامے کی تخلیق و تولید میں ان کا بڑا حصہ تھا فیض صاحب (جو ان دنوں راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں قید تھے) اور حسرت دونوں مل کر گھنٹوں اس نئے پرچے کی تشکیل کے متعلق سوچا کرتے تھے۔ حسرت صاحب کہنہ مشق صحافی تھے اور فیض ان کے مقابلے میں طفلِ مکتب۔ بہر حال ان دونوں نے مل کر ایک ایسے روزنامے کا نمونہ تیار کیا، جو دوسرے پرچوں نے نقل کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے "امروز" کا ہفتہ وار علمی و ادبی ایڈیشن بھی مرتب کرنا شروع کیا جس میں پہلی مرتبہ ملک کے تمام اہلِ قلم حضرات نے اپنی نگارشات طباعت کے لئے دیں۔

"امروز" میں اب حسرت صاحب نہیں ہیں۔ اس کا ناک نقشہ وہی ہے، جو انھوں نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا مگر افسوس ہے کہ اس کو یہ حسرت ہے کہ اس میں حسرت نہیں ہے۔ "حرف و حکایت" کا کالم جو ان کی واحد ملکیت تھا۔ اب اس پر ایک صاحب کی جن کا قلمی نام "پنج دریا" ہے، اجارہ داری ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جو "سند باد جہازی" لکھ سکتا ہے، جو سلیقہ اور قرینہ اسے نصیب ہے، وہ پنج دریا کے فلک کو بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔

مجھے قطعی طور پر معلوم نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ روزناموں میں

(انصر سائے پنجاب میں) مزاحیہ اور ذکاہیہ کالم مولانا ظفر علی خاں نے شروع کیا تھا، جو بعد میں مولانا چراغ حسن حسرتؔ کی ہلکی پھلکی او شگفتہ ظرافت کی ملکیت بن گیا۔

عبدالمجید سالک صاحب کو حسرت صاحب کے مقابلے میں فکاہی کالموں کے سلسلے میں پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ان دونوں میں بہت بڑا تفاوت ہے۔ سالکؔ ٹھیٹ امریکیوں کے مانند پھکڑ باز ہیں۔ حسرتؔ انگریزوں کی طرح کھل کر ہنسنے ہنسانے والے نہیں۔ مجھے سالک زیادہ پسند ہیں اس لئے کہ پنجابی ہونے کی حیثیت سے میں خود بہت بڑا پھکڑ باز ہوں۔

حسرتؔ صاحب تحریر و تقریر کے معاملے میں بڑے محتاط ہیں۔ ہمیشہ زبان کی اُلجھنوں میں گرفتار رہیں گے۔ اس کی باریکیوں کے متعلق غور و فکر کریں گے لیکن ان کی تحریروں میں مجہول اور تابع مجہول کی تکرار مجھے ہمیشہ کھٹکتی رہی ہے۔ معلوم نہیں وہ کس مجہول کے تابع ہیں؟

حسرت صاحب نے چند کتابیں لکھی ہیں جن کا اُردو ادب میں کوئی مقام نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے کبھی اس طرف رجوع ہی نہیں کیا۔ ان کی ساری عمر کاروباری زندگی میں گزری ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ ان کی بے شمار تصنیفات ہیں، جو ان کے نام سے

شائع نہیں ہوئیں۔ انھوں نے اسکولوں کے لئے کئی نصاب لکھے ہوں گے جن پر بحیثیت مصنف کے کسی پبلشر کا نام درج ہو گا۔

مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہے کہ انھوں نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا کہ اُردو ادب کو ان سے کتنی توقعات ہیں۔ وہ روپیہ وصول کرتے ہیں اور ادب کو جہنم میں جھونک دیتے ہیں۔ ورنہ، جیسا کہ مجھے قطعی احساس ہے اگر وہ محض کالم نویسی نہ کریں، زیادہ گپ بازیوں اور اپنے سے چھوٹے ادیبوں کو اپنی خداداد قابلیت سے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کریں تو وہ سعادت حسن منٹو سے چار قدم آگے ہوتے۔

میرے اس مضمون کا عنوان "شیر دارم شکرک" ہوتا۔ اس لئے کہ چراغ حسن حسرت کا ہم وزن ہے۔ ان کا دودھ ان کی تحریر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت میٹھا ہوتا ہے۔ اپنے متعلق میں بیان کر چکا ہوں کہ وہ مجھے یہ دودھ مینگنیاں ڈال کر دیتے رہتے ہیں۔

آج سے غالباً بیس برس پہلے کا ذکر ہے جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ ان دنوں میں نے "ہمایوں" اور "عالمگیر" کے روسی ادب نمبر مرتب کئے تھے۔ حسرت صاحب نے جو غالباً "زمیندار" یا "احسان" میں ملازم تھے، اپنے فکاہی کالم میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا، "منٹو آج کل کھٹ بنوں کی طرح صدا لگاتا پھرتا ہے کہ روسی نمبر

نکلوا لو، یا فرانسی نمبر نکلوا لو ۔۔۔ دوسرے الفاظ میں یہ کمسٹ بتوں کی مخصوص صدا تھی ۔۔۔ "منجی پیر جامی لٹکا لو"۔

یہ پڑھ کر میں نے لطف اُٹھایا، مگر کباب بھی ہوا۔ بہرحال جب تک حسرت صاحب زندہ ہیں (اور میری دعا ہے کہ کم از کم میری حیات تک زندہ رہیں) میں لطف اُٹھاتا رہوں گا اور کباب بھی ہوتا رہوں گا۔ معاف کیجئے گا۔ مجھے شاعری سے کوئی شغف نہیں، لیکن مجھے حسرت صاحب کے ایک دُور دراز کے رشتے دار غنی کاشمیری کا ایک شعر یاد آ گیا ہے ۔۔

کدام سوختہ جاں دست زد بداماننت
کہ از لباسِ تو بوئے کباب می آید

میرا خیال ہے کہ یہ حسرت صاحب ہی کی سوختہ جاں ہے۔ جس نے سروب ہوٹل میں کباب کھاتے ہوئے میرے دامن پر ہاتھ رکھ دیا کہ اب کباب ہونا میرے لئے ہر روز کی بات بن گیا ہے۔

غنی کاشمیری کا ذکر آیا ہے تو میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ حسرت صاحب اپنی عام گفتگو میں بڑے بڑے شعرا کے نام صرف اس غرض سے لیا کرتے ہیں کہ سننے والے ان کے رعب کے نیچے دب جائیں۔ ان کا ایسے موقعوں پر ایک مخصوص لب و لہجہ ہوتا ہے۔ جس کی نقل میں کر سکتا

ہوں۔ مگر یہ موقعہ محل نہیں، اس لئے کہ مجھے صرف یہ مضمون پڑھنا ہے۔

ان کا اندازِ گفتگو ویسے سارے لاہور میں مشہور ہے۔ انگوٹھے کے سامنے والی دو انگلیوں میں سگریٹ دبا کر وہ تانگے والوں کے انداز میں زور کا کش لگائیں گے۔ اور پوچھیں گے "مولانا آپ نے قاآنی کا مطالعہ کیا ہے؟"

اور اگر آپ میری طرح کم تعلیم یافتہ ہیں اور آپ کو فارسی سے کوئی شُد بُد نہیں، تو آپ مولانا چراغ حسن حسرت کے سامنے بالکل ایک چُغد کی حیثیت میں بیٹھے ہوں گے۔ پھر وہ آپ کو اور زیادہ چغد بنانے کے لئے فردوسی، سعدی، حافظ اور غالب کا فارسی کلام سنائیں گے اور آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوگی کہ خودکشی کر لیں۔

میں نے اب تک خودکشی نہیں کی، اس لئے کہ میں حسرت صاحب کی رگ رگ پہچانتا ہوں۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ وہ بڑی قابل شخصیت کے مالک ہیں۔ لیکن میں خود کو بھی کسی حد تک قابل سمجھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اب تک زندہ ہوں۔

حسرت صاحب کے متعلق یہ کہنا کہ وہ مردم کُش ہیں، سراسر غلط ہوگا۔ لیکن ان کے کردار میں ایک عجیب و غریب چیز یہ ہے۔ کہ وہ جلا کر مارتے ہیں۔ اور مار کر جلاتے ہیں۔ مجھے انھوں نے کئی مرتبہ موت کے گھاٹ اتارا

ہے۔ اور کئی بار اپنے اعجاز سے زندہ کیا ہے۔

ہم دونوں شرابی ہیں۔ لیکن ہم میں کچھ فرق ہے۔ وہ سمجھتے ہیں یا دوسروں کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ان کی بیگم کو ان کی شراب نوشی کا کوئی علم نہیں۔ یہاں یہ عالم ہے کہ دنیا جانتی ہے کہ میں پیتا ہوں اور اس دنیا میں میری رفیقۂ حیات بھی شامل ہے۔

میں آپ کو ایک دلچسپ لطیفہ سناؤں۔ دہلی میں ہم دونوں آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن میں ملازم تھے۔ اور اکثر اکٹھے پیا کرتے تھے۔ ان دنوں آپ نے شادی کی تھی۔ میرے اور ان کے گھر میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ اس لئے وہ ہمارے یہاں قریب قریب ہر روز آتے جاتے تھے۔ میری بیوی جانتی تھی کہ میں پیتا ہوں، لیکن حسرت صاحب کی بیگم صاحبہ یکسر منکر تھیں کہ وہ پیتے ہیں۔ حالانکہ یہ کھلی ہوئی حقیقت تھی کہ وہ پیتے ہیں اور بیچ کھیت پیتے ہیں۔ مگر وہ یہ فراڈ کرتے تھے کہ گھر میں رات کو ایک دو بجے کے قریب جاتے، جب کہ سب سوئے ہوئے ہوتے۔

ایک دن میں نے شرارت کی۔ ان کی بیگم صاحبہ ہمارے گھر میں تھیں۔ میں اور حسرت صاحب "بھولا رام اینڈ سنز" کے شراب خانے میں پی رہے تھے کہ مجھے اپنی بیوی کی طرف سے ایک چٹ ملی، جس میں یہ پوچھا گیا تھا کہ حسرت صاحب کہاں ہیں۔ میں نے جواباً لکھ دیا کہ وہ میرے ساتھ

شراب خانے میں موجود ہیں ـــــ لیکن یہ حسرت صاحب کا کمال ہے کہ ان کی بیگم نے میری اس تحریر پہ یقین نہ کیا۔

انہی دنوں کی بات ہے، ابھیلا رام کے شراب خانے میں ہم سب بیٹھے تھے۔ فیض، دیوندر ستیارتھی، محمد حسین بٹالیہ آرٹسٹ اور احمد ندیم قاسمی صاحب بیٹھے تھے کہ میری حسرت صاحب سے ٹکر ہو گئی۔ وہ حسب معمول مجھ پر رعب جمانے لگے۔ میں نے چڑ کر ان سے کہا کہ میرے نزدیک ان کی حیثیت صرف ایک لغت کی سی ہے۔ جس کے اوراق پلٹ کر آدمی کسی لفظ کے معنی دیکھتا ہے اور پھر اسے طاق پہ رکھ دیتا ہے۔ وہ بہت ناراض ہوئے۔ اس لئے کہ میرا یہ حملہ ان کی شخصیت پر بہت بڑا حملہ تھا۔

اسی دوران میں مختلف غیر ملکی مصنفوں کی بات چھڑ گئی ـــ مجھے سامرسٹ ماہم پسند تھا۔ میں نے اس کا نام جب بار بار لیا تو مولانا چراغ حسن حسرت صاحب نے پنجابی محاورے کے مطابق "میرا گڈّا اینہہ وِتا" ـــ اگر ان کا یہ کالم میرے پاس موجود ہوتا، تو میں یقیناً آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ اسے پڑھ کر میں بہت کباب ہوا تھا۔

دیوان سنگھ مفتون کا یہ کہنا ہے کہ اگر میں کسی کے خلاف کچھ لکھوں اور وہ اسے پڑھ کر رات کو آرام و اطمینان سے سو جائے، تو اس کا یہ مطلب ہے کہ مجھے بہت بڑی شکست ہوئی ہے۔ حسرت صاحب کو

میرے معاملے میں کبھی شکست نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ ان کی تحریروں نے جو مجھ سے متعلق ہیں، ہمیشہ مجھ پہ راتوں کی نیند حرام کی ہے ——— خدا انھیں زندہ رکھے، تاکہ میں غالب کے اس مصرعہ کا مطلب اچھی طرح سمجھ سکوں کہ

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

اختر شیرانی، حسرت صاحب کے دوست تھے۔ وہ کثرتِ شراب نوشی کے باعث مر گئے۔ باری صاحب تھے (جو خود کو انقلابی ادیب کہتے تھے) ان کو معلوم نہیں، شراب نوشی کی کثرت سے یا قلت سے دل کا عارضہ ہوا اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جو معلوم نہیں پانی بھی پیتا ہے یا کہ نہیں۔ میں شدید طور پہ بیمار ہوا اور تین مہینے میو ہسپتال میں رہ کر بھی جانبر رہا ——

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز تھا ساقی

لیکن ڈاکٹر پیرزادہ صاحب کچھ اور علاج کرتے رہے۔ بہرحال میں بچ گیا۔ حسرت صاحب کے معالج بھی غالباً پیرزادہ صاحب تھے۔ علاج ان کا وہی آبِ نشاط انگیز تھا مگر وہ شاعر اور ادیب نہیں۔ محض ڈاکٹر ہیں اس لئے انھوں نے ان کو موت کے منہ سے بچا لیا، جو بہت غیر شاعرانہ ہے۔

حسرت صاحب میو ہسپتال میں دو ڈھائی مہینے رہ چکے ہیں، ان کو

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اُن "کو بدرزی نقش دمیو سس" کا باعث لاحق تھا۔ جب میں ہسپتال میں داخل ہوا، تو پیرزادہ صاحب نے یہ تشخیص کی تھی کہ مجھے "سوراٗس لرر" کی شکایت ہے۔ بہرحال ہم دونوں ایک ہی "خانہ خراب" چیز کے شکار ہیں۔

سردیوں کی بات ہے، جب وہ میو ہسپتال میں تھے۔ مجھے وہاں سے نکلے ہوئے قریب قریب تین مہینے گذر چکے تھے۔ جب میں نے ایک روز "نوائے وقت" میں پڑھا کہ مولانا دل کے مرض میں گرفتار ہیں، تو مجھے بڑا تعجب ہوا کہ جہاں تک دل کی رعایت سے محبّت کا تعلق ہے۔ وہ کبھی گرفتار نہیں ہو سکتے۔ (ہو سکتا ہے، ان کے متعلق میرا نظریہ غلط ہو)۔

جب وہ ہسپتال میں داخل ہوئے ہیں تو اس سے پندرہ بیس روز پیشتر میری ان کی ملاقات ہوئی۔ غالباً "ادارہ فروغِ اُردو" میں، اس سے چند روز پہلے میں نے تھوڑی تھوڑی پینا شروع کر دی تھی اور وہ بھی ڈر ڈر کے۔ مولانا سے۔ ان سے ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں ہم میو ہسپتال کے پاس پہنچے۔ تو میں نے ان سے عرض کیا "بوندا باندی ہو رہی ہے۔ آج کوئی پروگرام ہونا چاہیئے۔"

انھوں نے۔ مجھے بہت ڈانٹا۔ میری صحت کے پیشِ نظر ایک لمبا چوڑا لکچر دیا، لیکن آخر کار میرے ساتھ پینے پہ رضامند ہو گئے اور نتیجہ

اس کا یہ ہوا کہ وہ میو ہسپتال میں داخل ہوئے اور دو ڈھائی مہینے تک وہاں مقیم رہے ۔۔۔

میں ان کا بہت عقیدت مند ہوں۔ ایک مرتبہ میں نے تہیہ کیا کہ ان کے پاس جاؤں گا، لیکن رستے میں ایک نرس مل گئی، اس سے بات چیت ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ اس نے سمجھ لیا کہ میرے مُنہ سے "آئیڈ ڈی فارم" کی بو نہیں آ رہی۔ اس لئے میں وہاں سے بھاگ گیا۔ اور ایسا بھاگا کہ پھر میو ہسپتال کا رُخ نہ کیا۔

حسرت صاحب بفضلِ خدا اب تندرست ہیں۔ میں تو میو ہسپتال کے جنرل وارڈ میں رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس دولت ابھی تک موجود ہے، جو شاید انھوں نے اپنی "میجری" کے زمانے میں کمائی ہو گی۔ اس لئے کہ وہ "فیملی وارڈ" میں رہے۔ بہرحال اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ پینا چھوڑتے ہیں یا نہیں۔

یہ مضمون نامکمل ہے، اس لئے کہ میں نے افراتفری میں لکھا ہے ؀

اس مضمون کا پہلا حصّہ جو آپ نے پڑھا ہے، میں نے بڑی رواداری میں لکھا تھا۔ میں نے صبح اخباروں میں دیکھا کہ حسرت صاحب کے صحت یاب ہونے کی خوشی میں اُردو ادب کے اور مولانا کے دوست وائی۔ ایم سی۔ اے

ہیں ایک جلسہ کر رہے ہیں۔ حسرت صاحب سے چونکہ مجھے عقیدت ہے
اور میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے اپنا عزیز سمجھتے ہیں۔ اس لئے میں نے اپنا
فرض سمجھا کہ ان کے بارے میں جو میرے احساسات ہیں، قلم بند کروں
اور اس جلسے میں حاضرین کو پڑھ کے سناؤں۔

چنانچہ میں نے قلم اُٹھانے سے پہلے، محمود نظامی صاحب ریجنل
ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان (لاہور) کو ٹیلی فون کیا اور ان سے دریافت کیا
کہ اگر میں حسرت صاحب کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں، تو کیا مجھے اسکی
اجازت ہو گی۔ انھوں نے حسبِ معمول اپنی 'فارغ البالی' سے کام
لیتے ہوئے کہا تمیں کون روک سکتا ہے۔ آؤ اور پڑھو۔

مصیبت یہ تھی کہ مجھے اسی دن لاہور ریڈیو اسٹیشن سے سات بجے
اپنا تازہ افسانہ براڈکاسٹ کرنا تھا اور حسرت صاحب کی صحت یابی
سے متعلق جلسہ ساڑھے چھ بجے شروع ہونا تھا۔ میں نے عشرت رحمانی
صاحب (اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر) سے مشورہ کیا۔ انھوں نے ازراہِ
عنایت فرمایا کہ تم کچھ فکر نہ کرو۔ یہاں افسانہ پڑھو۔ باہر موٹر کھڑی ہے
وہ تمیں وائی۔ ایم۔ سی۔ اے پہنچا دے گی۔

اسی دن ایک اور مصیبت مجھ پر یہ آئی۔ کہ افراتفری کے عالم
میں جب میں نے حسرت صاحب کے متعلق اپنے چند احساسات کاغذ پر

گئے، تو ساڑھے تین کے قریب کامریڈ سبطِ حسن تشریف لے آئے
آپ نے اس خیال کے پیشِ نظر کہ میں اگر بیٹھا رہا، تو ضرورت سے
زیادہ پینا شروع کر دوں گا، مجھ سے اپنے بڑے پیارے انداز میں
فرمایا کہ میں ان کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہفتہ وار میٹنگ
میں چلوں۔

میں نے اپنی بیوی کو ساتھ لیا کہ آج کل وہ مجھے کہیں اکیلا نہیں
چھوڑنا چاہتی۔ ہم نقی بلڈنگ کے ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں
سوویٹ کلچر ایسوسی ایشن کا دفتر ہے۔ بڑا تیسرے درجے کا ــــ خیر یہ
جملۂ معترضہ تھا، میں نے حسبِ عادت یہ زیادتی کی کہ سبطِ حسن صاحب
کو صدارت کے لئے مجبور کیا، پھر ان پر زور دیا کہ جو خط انھوں نے میری
درخواست پر میرے نام لکھا تھا، پڑھیں۔ اس کے بعد برادرم احمد ندیم قاسمی
سے بھی یہی سلوک کیا۔ چنانچہ انھوں نے بادلِ ناخواستہ وہ مضمون پڑھ
کے سنایا جو انھوں نے میرے بارے میں "دو شخصیتیں" کے عنوان سے
تحریر فرمایا تھا۔ اس کے بعد سب سے بڑی زیادتی میں نے یہ کی کہ
حسرت صاحب کے متعلق اپنے تاثرات حاضرین کو جن کی تعداد تیس چالیس
سے زیادہ نہیں تھی سنا دیا۔ اور یہ میٹنگ اس لئے دلچسپی رہی کہ اس
میں صرف میرا نام گونجتا رہا۔ حالانکہ مجھے اس بات کا زعم ہے کہ جہاں میرا

نام لیا جائے، وہاں اور کچھ نہیں تو ایک سنسنی خیز ہنگامہ برپا ہونے
کے آثار ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔

لیکن مجھے اپنے اس نظم کے بارے میں زیادہ دیر تک مایوسی نہ ہوئی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ سے فارغ ہو کر ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔ میری بیوی اور شاد امرتسری دونوں مجھے مناسب و موزوں ہدایات دینے کے لئے "کمرہ نشر" میں موجود تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ میری گاڑی پٹڑی سے اُتر گئی اور افسانے کا ایک پورا پیراگراف براڈکاسٹ ہونے سے رہ گیا۔

حسرت صاحب پر میں نے جو مضمون لکھا تھا، وہ شاید سلیم شاہد صاحب کے حوالے کر دیا تھا تاکہ وہ اسے سنسر کر لیں۔ اور عبداللہ بٹ صاحب کو بھی دکھا دیں۔ میری تحریروں پر اکثر لوگوں کو اعتراض ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بدمزگی پیدا ہو ـــــــ لیکن ہوئی اور ایک ہنگامے کا باعث بنی۔

ریڈیو اسٹیشن سے میں سیدھا وائی، ایم، سی، اے پہنچا۔ ہال میں سو ڈیڑھ سو آدمی تھے۔ ہم پچھلے بنچوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے فوراً عبداللہ بٹ سے پوچھا کہ آیا مجھے اپنا مضمون پڑھنے کی اجازت ملے گی۔ انھوں نے فرمایا کہ ریڈیو آرٹسٹ، حسرت صاحب کی غزل گانے سے فارغ

ہو جائے، تو تمہاری باری آئے گی مضمون میرے پاس نہیں تھا۔ معلوم ہوا

کہ صاحب صدر میرٹیرم ایم۔ ایل۔ اے کی تحویل میں ہے۔

گانے کے آخری بول ختم ہوئے تو میں ڈائس پہ پہنچا۔ صاحب صدر

نے مضمون میرے حوالے کیا۔ میں نے ایک نظر حسرت صاحب کی طرف

دیکھا۔ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ویسی کی ویسی تھیں، مگر بے حد لاغر تھے

پھولوں کے ہاروں سے لدے پھندے ایک ایسے بوڑھے دولہا دکھائی

دے رہے تھے جنھیں پانچویں چھٹی شادی کرنے کا شوق چرایا ہو۔

اردو صحافت سے حسرت صاحب کا رشتہ بہت مضبوط ہے۔

وہ خدانخواستہ مر بھی جائیں، تو مزاح نگاری ساری عمر عدت میں گذار

دے گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے اپنا یہ جلوس نکالنے یا اپنا

جلسہ کرانے کا تکلف کیوں کیا۔ وہ اس سے بالاتر ہیں۔

بہرحال میں نے دل ہی دل میں اس بات کا افسوس کرتے ہوئے

کہ میں ان کی شدید علالت کے دوران میں عیادت کے لئے نہ گیا، اپنا

مضمون پڑھنا شروع کیا۔

حسرت صاحب اپنے موڈ میں نہیں تھے۔ شاید تعریفوں کی بھرمار

اور پھولوں کے بوجھ سے ان کی طبیعت مکدر ہو چکی تھی، یہی وجہ ہے

کہ انھوں نے اس سعادت مند کے احساسات کو بھی جو کافی بے تکلف تھے

گوارا نہ کیا۔ جب میں ایک صفحہ پڑھ چکا، تو انھوں نے مجھے اور صاحب صدر کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا کہ یہ کیا بکواس ہے۔

بکواس تو میں عام کیا کرتا ہوں، لیکن جہاں تک حسرت صاحب کا تعلق ہے۔ ان کے متعلق میں کبھی بکواس نہیں کر سکتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں نے ان کے کردار و اطوار کے متعلق چند ایسی باتیں اپنے لجیسٹ افسانوی مگر صاف گو انداز میں بیان کر دی ہیں جو ان کی طبع نازک پر بار گذری ہوں، لیکن میرے پھکڑپن کے پیش نظر اور اس محبت کو سامنے رکھتے ہوئے جو مجھے ان سے ہے۔ اور یقیناً ان کو بھی ہے: مجھے معاف کر دینا چاہیئے تھا۔

جب میں نے دیکھا کہ ان کی خفگی زیادہ شدت اختیار کر گئی ہے، تو میں نے صاحب صدر سے کہا "اگر حسرت صاحب چاہیں تو میں اپنا مضمون پڑھنا بند کر دیتا ہوں" مگر انھوں نے ارشاد فرمایا کہ نہیں مضمون پڑھنا جاری رکھو"

سخت گرمی تھی، کچھ حسرت صاحب کے مزاج کی بھی۔ میں پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ مضمون ختم ہوا، تو میں نے حسرت صاحب کے پاس فرش پر بیٹھ کر معذرت چاہی، لیکن اس وقت وہ درگذر کرنے، یا میرے احساسات کے خلوص کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے ــــــ میں نے کہا، ہٹاؤ، یہ

شخص اگر نہیں مانتا، تو نہ مانے ــــ اور اسٹیج سے اُتر کر مصورِ پاکستان جناب عبدالرحمٰن چغتائی صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ انھوں نے کمال شفقت سے میرا اکّہ ردّ کیا۔ اس کے بعد میں وہاں سے چلا گیا۔

دوسرے روز سننے میں آیا کہ سعادت حسن منٹو کی وائی، ایم، سی، اے میں حجامت ہوتے ہوتے رہ گئی، کیونکہ حسرت صاحب کے مداحوں کو میری ہرزہ سرائی بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ ایک بیان یہ بھی ہے کہ وہاں کچھ مداح میرے بھی تھے۔ جو ہر اس شخص کی حجامت کرنے کے لیے تیار تھے جو میری حجامت پر آمادہ ہوتا ــــ اگر یہ دونوں باتیں درست ہیں، تو مزا آ جاتا۔ اس جلسے میں جتنے اصحاب تھے، ان کی مفت میں حجامت ہو جاتی ــــ اور میں تو چچا غالب کا یہ شعر پڑھ کے ان تمام حجاموں کو سناتا۔

؎ ہوسِ گُل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا اس بے پر و بالی نے مجھے

لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ مجھے ایسے موقع پر جب کسی عظیم شخصیت کی "برسی" (معلوم نہیں یہ لفظ کیوں استعمال کیا گیا تھا) منائی جا رہی تھی، ایسا مضمون جو تقدیس کے معیار پہ پورا نہیں اُترتا تھا، ہرگز ہرگز پڑھنا نہیں چاہیے تھا۔

یہ ایک ایسی بات ہے جس کے متعلق بہت کچھ کہا سنا جا سکتا ہے

—— حسرت صاحب کی تقدیس کسی ولی یا پیغمبر کی تقدیس نہیں۔ ان کی شخصیت سے اُن کی صحافت نگاری اور مزاح نویسی ہی سے کسی کو عقیدت ہو سکتی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح مجھے کئی لوگ محض باتیں بنانے والا سمجھتے ہیں اور افسانہ نگار نہیں مانتے، ان کو بھی چند لوگ محض ایک کالم نگار سمجھتے ہوں، مگر اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے۔

انسان وہی ہے، جو کچھ کہ وہ ہے۔ اس کا رتبہ وہی ہے جو اس نے خود اپنے لئے قائم کیا ہے —— دنیا جائے جہنم میں۔ اگر سعادت حسن منٹو حسرت صاحب کے متعلق چند باتیں ایسی کہہ دیتا ہے جو سچی ہونے کے باعث کڑوی ہیں، یا جھوٹی ہونے کی وجہ سے کسیلی، تو اس پر اتنی ناک بھوں تو نہیں چڑھانی چاہیئے کہ اپنا حلیہ ہی بگڑ جائے۔

ہر انسان کو جو ادب یا صحافت کے میدان میں آتا ہے معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی زندگی کا واحد مالک نہیں ہوتا۔

میں تو خیر افسانہ نگار ہوں۔ بہت سے جیتے جاگتے، چلتے پھرتے کرداروں کو فرضی نام دے کر ان کی کہانیاں لکھتا رہتا ہوں، لیکن حسرت صاحب کو جو ہر روز کالم نویسی کرنا پڑتی ہے، اس کو ان میں تمام سیاسی اور تجارتی شخصیتوں کے اصل نام لکھنے پڑتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے بغیر کوئی اور چارہ ہی نہیں۔

میرے مقابلے میں وہ بہت بڑے "پگڑی اچھال" ہیں۔ اس فن میں انہیں کافی مہارت حاصل ہے لیکن ایک بات انہیں بھولنا نہیں چاہیئے کہ سو سنار کی اور ایک لوہار کی ـــــ میں لوہار نہیں ہوں، سنار ضرور ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ ان کو میرا یہ "سنار پنا" کیوں پسند نہ آیا۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس جلسے میں جو کہ اب میری وجہ سے کافی حد تک بدنام ہو چکا ہے، خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی صاحب نے ایک دعا پڑھی۔ میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ تمہیں مضمون کے بجائے ایک اور دعا پڑھ دینی چاہیئے تھی۔

میں حسرت صاحب کی طرح فارسی اور عربی کا عالم نہیں۔ بہر حال کفارے کے طور پر جو دعا میری زبان پر آئی ہے، یہاں لکھے دیتا ہوں۔

"خداوند ـــ تو نہ کھاتا ہے نہ پانی پیتا ہے ـــ تیرا وجود ہے بھی اور نہیں بھی ہے ـــ یہ کیا مصیبت ہے۔ تیری دنیا میں ہم کھاتے بھی ہیں اور پیتے بھی ـــ پانی بھی اور شراب بھی۔ تیرا ایک بندہ چراغ حسن حسرت ہے، جو صحافت کا چراغ ہے۔ اس کو پینے پلانے کی لت ہے، جس طرح مجھے ہے۔ ہم دونوں بڑے آدمی ہیں مطلب یہ ہے ـــ لیکن مطلب بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے، تو سب

باتیں بجا رہا ہے —— پھر یہ کیا ظلم ہے کہ آئے دن تو ہمیں بیمار کر دیتا ہے
—— خدا کی قسم یہ اچھی بات نہیں —— میں نے تیری ہی قسم
کھائی ہے، اگر کسی اور کی کھائی ہوتی، تو تو میرا بیڑہ غرق کر دیتا۔"

نماز کبھی میں نے پڑھی ہے، نہ میرے محترم دوست حسرت صاحب نے،
بہر حال ہم تیرے قائل ضرور ہیں، اس لئے کہ تو ہمیں شدید طور پہ بیماری
میں مبتلا کر کے پھر اچھا کر دیتا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ ٹھیک نہیں۔ میں یہ
نہیں کہتا کہ تو ہمیں حیاتِ جاوداں عنایت فرما۔ میری صرف یہ درخواست
ہے کہ تو مجھے ایک سال کے اندر اندر مار دے لیکن حسرت صاحب
کو کم از کم بیس برس اور زندہ رکھ، تاکہ وہ اس دوران میں بھی لڑکوں
کو یقین دلاتے رہیں۔ کہ انھیں دخترِ رز سے کوئی واسطہ نہیں۔

حسرت صاحب کو اگر تو نے بیس برس اور زندگی عطا فرما دی، تو
میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہ تیرا جغرافیہ لکھ دیں گے، جو تو اپنے آسمانوں
کے اسکولوں میں نصاب مقرر کر سکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ رائلٹی
مجھے ملے۔

تو عالم الغیب ہے —— میری سفارش کے متعلق تو اچھی طرح
سمجھ سکتا ہے، اس سے زیادہ میں اور کچھ کہنا نہیں چاہتا، اس لئے کہ
شاید تو میرا اسی وقت ٹینٹوا دبا دے جس کو دبانے کی حسرت، حسرت صاحب

کر اب تک رہی ہے!"

یہ دُعا تو مانگ چکا۔ بد دُعا مانگتا تو وہ کچھ اس قسم کی ہوتی:۔

"اے اللہ میاں ۔۔ حسرت صاحب کو موسیو استالن بنا دے، تاکہ وہ اس امر کی طرح آہنی پردے کے پیچھے اپنی من مانی کرتے رہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے جتنے کمیونسٹ ہیں، ان کے تابع ہیں اور ان کے گن گاتے ہیں۔

"اگر تو انہیں کامریڈ استالن نہیں بنا سکتا (اس لئے کہ یہ تیرے لئے بھی کسی قدر مشکل ہے) تو انہیں مرزا محمود بنا دے، تاکہ وہ اپنی ایک اُمّت بنا سکیں۔ احمد بشیر (جو آج کل لوگوں کے خاکے لکھتا پھرتا ہے) ان کے سکتر ہوں، تاکہ ان سے ناراض ہونے پر وہ ایک اور خاکہ لکھ سکے۔

"یہ بھی نہیں کر سکتا، تو انہیں سعادت حسن منٹو بنا دے۔"

یہ بد دعا، دعا سے چھوٹی ہے، لیکن کافی جامع ہے۔

حسرت کے متعلق اور بہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے، مگر ڈر ہے کہ وہ اور زیادہ ناراض نہ ہو جائیں، لیکن میں بھی ایک ہی حضرت ہوں۔ چلتے چلتے آپ کو ان کے متعلق ایک لطیفہ سنائے دیتا ہوں۔

بہت دنوں کی بات ہے، آپ "امروز" کے ایڈیٹر تھے۔

میں اور "نیا ادارہ" کے مالک چوہدری نذیر ان سے ملنے گئے۔
چوہدری صاحب نے ان کو کچھ رقم پیشگی کے طور پر دے رکھی تھی کہ
وہ ان کو ایک کتاب لکھ کر مرحمت فرمائیں۔ باتوں باتوں میں چوہدری
صاحب نے اس کا ذکر کیا۔ حسرت صاحب کو یہ بات اس قدر ناگوار
گذری کہ تمام پبلشروں کی ہشت پشت کو بے نقط سنانا شروع کر دیا۔
مجھے تاؤ آ گیا۔ چنانچہ حسرت صاحب کی ان "بے نقطیوں" کو سنتا
لے کر (ان کی اجازت کے بغیر) ان کے حق میں زیادہ سے زیادہ
بیس پچیس سانسوں کے اندر اندر استعمال کر دیں۔ حسرت صاحب کی
زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ کسی بدتمیز انسان نے ان سے ایسی
بدتمیزی کی تھی۔ ان کے لئے یہ اتنا بڑا صدمہ تھا کہ منہ سے ایک لفظ
بھی باہر نکال نہ سکے۔ میں خاموش ہوا، تو ان کو فوری طور پر اس بات
کا بڑی شدت سے احساس ہوا کہ میں نے ان کی توہین کی ہے۔ میں
اُٹھ کر جانے ہی والا تھا کہ انھوں نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں کہا
"مولانا صاحب ذرا بیٹھئے۔"
میں ذرا کیسے بیٹھتا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ گفتگو کے ہر
معاملے میں ان کی لغت میری ڈکشنری پر بھاری ہے۔ چنانچہ میں نے
ان سے عرض کیا "حسرت صاحب، معاف فرمائیے۔ میں اب یہاں ایک

منٹ بھی نہیں بیٹھ سکتا ـــــ میرا غصہ فرو ہو چکا ہے، آپ کے غصے کا پارہ چڑھ رہا ہے۔ میں گدھا ہوں، اگر آپ کو موقع دوں کہ آپ مجھے گالیاں دے سکیں ـــــ سلام علیکم۔"

یہ کہہ کر میں چل دیا۔ بعد میں سنا کہ وہ رات بارہ بجے تک اندر ہی اندر کھولتے رہے۔

مجھے اس بات کا کامل احساس ہے کہ حسرت صاحب ایسے بزرگیت پسند بزرگ کے سامنے میں نے بہت زیادتی کی، لیکن ہر انسان کو ایسے مواقع ضرور بہم پہنچانے چاہئیں کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے اندر ہی اندر کھولے اور بس کھولتا رہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس عمل سے آدمی سنورتا ہے نکھرتا ہے ـــــ جس طرح بھٹی چڑھا ہوا کپڑا۔

اب میں آپ کو حسرت صاحب کا ایک اور پہلو دکھاتا ہوں، جو بے حد شریف اور دوست پرور ہے ـــــ ان سے میرے تعلقات بظاہر کشیدہ ہو چکے تھے۔ مجھ پہ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کے سلسلے میں مقدمہ چل رہا تھا۔ فیصلہ ہوا، تو مجسٹریٹ صاحب نے مجھے تین سو روپے جرمانہ اور تین ماہ قید بامشقت کا حکم سنایا۔ اس کی خبر اخبار دل میں شائع ہوئی تو حسرت صاحب نے کمال شفقت سے مجھے ایک رقعہ لکھا جس میں یہ عبارت مرقوم تھی کہ مجھے آپ کی سزا پر بہت افسوس ہوا ہے۔ اگر میں

آپ کی کوئی خدمت کر سکوں، تو حاضر ہوں۔

مجھے تو سزائیں ملتی رہیں گی اور حضرت صاحب افسوس کرتے رہیں گے لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم دونوں اس ملک میں جو پہلے ہندوستان تھا اور اب پاکستان، ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں اور تادمِ آخر بھگتتے رہیں گے ——— ہمارے اپنے آدمی دم تحریر موجود ہوتے ہیں مگر ان فرشتوں کو کیا کہیے، جن کے کہے پہ ہم پکڑے جاتے ہیں۔

پُراسرار زینا

شاہدہ جو کہ محسن عبداللہ کی فرماں بردار بیوی تھی اور اپنے گھر میں خوش تھی۔ اس لئے کہ علی گڑھ میں میاں بیوی کی محبت ہوئی تھی اور یہ محبت ان دونوں کے دلوں میں ایک عرصے تک برقرار رہی۔

شاہدہ اس قسم کی لڑکی تھی جو اپنے خاوند کے سوا اور کسی مرد کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ لیکن محسن عبداللہ ایسا نوجوان تھا جو مختلف پُھولے پُھولے کھِلنے کا عادی تھا۔ شاہدہ کو اس کی اس عادت کا علم نہیں تھا۔ ویسے وہ جانتی تھی کہ اس کے خاوند کی بہنیں بڑی آزاد خیال ہیں، مردوں سے بڑی بے باکی سے ملتی ہیں۔ ان سے جنسیات کے بارے میں گفتگو کرنے سے بھی نہیں جھجکتیں۔ مگر اسے ان کے یہ انداز پسند نہیں تھے۔

محسن کی ایک بہن (ڈاکٹر رشید جہاں) نے تو ایسے پر پُرزے نکالے تھے کہ حد ہی کر دی تھی ——— میں ان دنوں ایم اے او کالج امرتسر میں پڑھتا تھا۔ اس میں ایک نئے پروفیسر صاحبزادہ محمود الظفر آئے۔ یہ ڈاکٹر رشید جہاں کے خاوند تھے۔

میں بہت پیچھے چلا گیا ہوں۔ لیکن واقعات کیونکہ اچانک میرے دماغ میں آ رہے ہیں اس لئے میں مجبور ہوں کہ اس مضمون کا تسلسل قائم نہیں رہ سکے گا۔ بہر حال آپ پڑھیں گے تو آپ کڑیاں ملا سکیں گے۔

پروفیسر صاحبزادہ محمود الظفر بڑے خوش شکل نوجوان تھے۔ ان کے خیالات اشتراکی تھے۔ اسی کالج میں فیض احمد فیض صاحب جو بڑے اُفیمی قسم کے آدمی تھے پڑھایا کرتے تھے۔ ان سے میرے بڑے اچھے مراسم تھے۔

ایک ہفتے کی شام کو انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ ڈیڑھ دو دن جا رہے ہیں۔ چند چیزیں انہوں نے مجھے بتائیں کہ میں خرید کر لے آؤں۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے بعد ہر ہفتے اُن کے حکم کی تعمیل کرنا میرا معمول ہو گیا۔

وہ دراصل ڈیڑھ دو دن میں ڈاکٹر رشید جہاں سے ملنے جاتے

تھے۔ اُن سے غالباً اُن کو عشق کی قسم کا کوئی لگاؤ تھا۔ معلوم نہیں اس لگاؤ کا کیا حشر ہُوا۔ مگر فیض صاحب نے ان دنوں اپنی افیمگی کے باوجود بڑی خوبصورت غزلیں لکھیں۔

یہ تمام ضمنی مناظر ہیں۔ محسن عبداللہ کو کسی دوست کی وساطت سے بمبئی ٹاکیز میں ملازمت مل گئی۔ اُن دنوں یہ فلمی ادارہ بڑا وقار رکھتا تھا۔ اس کے روح رواں ہمانسو رائے تھے۔ وہ تعلیم اور اچھی فضا کے بہت قائل تھے۔ ان کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ پڑھے لکھے لوگوں کو اپنے اسٹوڈیو میں جگہ دیں۔

محسن عبداللہ کو لیبارٹری میں جگہ مل گئی۔ ہمانسو رائے آنجہانی کے احکام کے مطابق اسٹوڈیو کے کسی اعلیٰ اور متوسط کارکن کو "ملاڈ" (جہاں کہ یہ نگار خانہ تھا) سے دور رہائش اختیار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ قریب قریب سب اسٹوڈیو کے آس پاس ہی رہتے تھے۔ محسن عبداللہ اپنی بیوی مشاہدہ کے ساتھ قریب ہی ایک چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی کوٹھی میں مقیم تھا۔

محسن لیبارٹری میں بڑی توجہ سے کام کرتا تھا۔ ہمانسو رائے اُس سے بہت خوش تھے۔ اس کی تنخواہ اتنی ہی تھی جتنی اشوک کمار کی تھی جب وہ اس لیبارٹری میں ملازم ہُوا تھا۔ مگر وہ اب کامیاب ایکٹر بن رہا تھا۔ اُن دنوں آزوری اور ممتاز بھی وہیں تھے۔ مسٹر مکرجی جو

اس وقت مسٹر واچا ساؤنڈ ریکارڈسٹ کے اسسٹنٹ تھے۔ سب خوش باش آدمی تھے۔

ہر سال ہولی کے موقع پر بڑا دلکش ہنگامہ برپا ہوتا سب ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے۔ اور بڑی پیاری رنگ رلیاں مچتیں۔

"پنر ملن" کی شوٹنگ شروع ہوئی تو ہمانسو رائے نے سنہیہ پربھا پردھان کو جو خاصی پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اپنے اس فلم کے لئے ہیروئن منتخب کیا ان دنوں خواجہ احمد عباس وہاں پبلسٹی کا کام کرتے تھے۔ محسن اور عباس دونوں اس لڑکی پر عاشق ہو گئے جو سندھ کی رہنے والی تھی اور بمبئی میں نرسنگ کا کورس مکمل کر چکی تھی۔ محسن اور عباس دونوں چاہتے تھے کہ پربھا ان کے جذبات کی نرسنگ کرے۔ مگر وہ بڑی تیز نشتر تھی۔ وہ دونوں کو چرکے لگاتی تھی۔

یہ ایک لمبی کہانی ہے جسے میں پھر کسی وقت لکھوں گا۔

محسن اس کے عشق میں کچھ ایسا مبتلا ہوا کہ اس نے بے تحاشا جوا کھیلنا شروع کر دیا۔ اسے جتنی تنخواہ ملتی سب قمار بازی کی نذر ہو جاتی۔ شاہدہ سخت پریشان تھی۔ اس کو اپنے گھر سے ہر مہینے کچھ نہ کچھ منگوانا پڑتا تھا۔ اس کے ایک بچہ بھی ہو چکا تھا جو کئی دن بیمار رہتا اس کے علاج پر کافی خرچ کرنا پڑتا تھا۔

شاہدہ نے ایک دن اس سے بڑے شریفانہ انداز میں کہا: "مستی تم میرا خیال نہیں کرتے ——— کم از کم اپنے بچے کا ذکر کرو" وہ اس پر بہت برسا۔ اس لئے کہ اس کے سر پر جوئے اور منہ پر بھاپ رومان کا عشق سوار تھا۔

میں ان دنوں نانو بھائی ڈیسائی کے ہندوستان سنے ٹون اسٹوڈیو میں ملازم تھا۔ شانتا رام نے جو پربھات فلم کمپنی میں کئی شاندار فلم تیار کر چکے تھے۔ مجھے دعوت دی کہ تم پونا آؤ۔ کئی صحافی اور افسانہ نویس وہاں جا رہے تھے۔ یہ خیر سگالی قسم کی دعوت تھی۔ مدعو کئے گئے لوگوں میں ایک صاحب ڈبلیو زیڈ احمد بھی تھے۔ جو غالباً سادھنا بوس کی ٹیم میں کام کرتا تھا۔ مجھے اتنا یاد ہے احمد نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ بنگالی کے مکالمے اردو میں ترجمہ کرتا ہے۔

ہم پونا میں دو روز رہے۔ اس دوران میں مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ وہ اپنے چہرے پر خول چڑھائے رکھتا تھا۔ اس کی ہنسی۔ اس کی گفتگو۔ اس کا ہر انداز مصنوعی سا دکھائی دیتا تھا۔ ایک اور بات جو میں نے نوٹ کی تھی وہ یہ تھی کہ وہ مشہور یہودی ڈائرکٹر ارنسٹ لوبشن کی طرح ہر وقت منہ میں ایک لمبا سا سگار دبائے رکھتا تھا۔

اس کے بعد میری احمد اس کی ملاقات راماشنکل ایکیڈ کے مکان پر ہوئی۔ وہ میرا دوست تھا۔ میں جب اس کے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک کونے میں ڈبلیو زیڈ۔ احمد بیٹھا راما کی محبوب شراب رم پی رہا ہے۔

اس سے علیک سلیک ہوئی، بڑی رسمی قسم کی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی سے کھل کر بات کرنے کا عادی نہیں۔ وہ ایک کچھوا ہے جو اپنی گردن جب چاہے اپنے سخت خول کے اندر چھپا لیتا ہے۔ آپ ڈھونڈتے رہیں مگر نہ ملے۔

میں نے اس سے کہا "احمد صاحب آپ کچھ بات تو کیجئے۔"

وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسا "آپ راماشنکل سے باتیں کر رہے ہیں، کیا یہی آپ کے لئے کافی نہیں ہیں۔"

یہ جواب سن کر مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی سیاستدان سے ہم کلام ہوں۔ سیاست سے مجھے سخت نفرت ہے۔

احمد سے راماشنکل کے فلیٹ پر متعدد مرتبہ ملاقات ہوئی لیکن وہ کھل کر پھر بھی نہ بولا۔ وہ کونے میں کرسی پر بیٹھا رم پیتا رہتا تھا۔ میں اور راماشنکل اپنی بکواس میں مشغول رہتے۔

قریب قریب دو سال گذر گئے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ ڈبلیو زیڈ احمد

کوئی فلم کمپنی قائم کر رہے ہیں ـــ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ بنگالی کے مکالمے ترجمے کرنے والا یہ شخص کیسے فلم کمپنی بنائے گا؟

مگر اس نے بنا لی ـــ پتہ نہیں اس کا نام شاید بمبئی اسٹوڈیو رکھا گیا۔ اشتہار بازی فوراً شروع ہو گئی۔

میں نے یہ اشتہار دیکھے۔ ان میں خاص زور ایک ایکٹرس "نینا" پر دیا جاتا تھا۔ جس کو بار بار پر اسرار کہا جاتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسی ایکٹرس میں اسرار کیا ہو سکتا ہے؟ جب کہ سے اسکرین پر آنا ہے اس کے تو سارے بھید وہیں کھل جائیں گے۔

مگر دو برس تک برابر یہی پبلسٹی ہوتی رہی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ پُر اسرار نینا کون ہے؟ مگر کسی کو اس نئے چہرے کے متعلق علم نہیں تھا۔

بابو راؤ پٹیل ایڈیٹر فلم انڈیا کے ساتھ مجھے اتفاقاً کام کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا "سالا تم جانتا نہیں ـــ کیسا ایڈیٹر بنا پھرتا ہے۔ وہ ـــ تم محسن عبداللہ کو جانتا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں نام سنا ہے ـــ کچھ کچھ ان کے متعلق جانتا ہوں۔"

"نینا، اس کی بیوی ہے ـــــ۔ اب سمجھا؟"

"میں نہیں سمجھا۔"

"اس کا نام شاہدہ ہے۔"

میں نے جب بابو راؤ سے مزید استفسار کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ شاہدہ رینو کا دیوی کی بھاوج ہے۔ میں نے اسے لمبے ٹاکیز کی فلم "بھابی" میں ہیروئن کے رول میں دیکھا تھا اور اس کی کردار نگاری سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اب میرے دماغ میں دو بھابیاں تھیں۔ ایک لمبے ٹاکیز کی "بھابی" دوسری شاہدہ عرف نینا۔ رینو کا دیوی کی بھابی۔

مجھے ڈبلیو۔ زیڈ احمد سے مزید ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے سوچا کہ وہ بڑا اندازہ گیر ہے۔ وہ دھیمیں سے چلنے والا انسان ہے۔ سوویت روس کے آمروں کی طرح کئی کئی برسوں کی سکیمیں بناتا ہے اور بڑے اطمینان سے ان کے نتائج کا انتظار کرتا ہے۔

میں بڑا جلد باز ہوں۔ اس لئے فطری طور پر مجھے اس سے کوئی لگاؤ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں بڑ بولا تھا۔ وہ نہایت کم گو۔ اس میں تصنع ہی تصنع تھا اور میں اس بناوٹ کا سخت مخالف۔ وہ باتیں کرتا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کوئی مشین بول رہی ہے۔

لیکن مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ جب بھی بولتا تھا تلی

بات کہنا چاہیے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ وہ کئی زبانیں بولتا تھا۔ مرہٹی۔
گجراتی۔ اُردو۔ انگریزی اور پنجابی۔ اصل میں وہ پنجابی ہے۔ اس کے
خاندان کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔ مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ مولانا صلاح الدین احمد
(ایڈیٹر ادبی دنیا) اس کے بھائی ہیں۔ اس کے ایک بھائی ریاض احمد بھی
ہیں جو کسی اچھے سرکاری عہدے پر فائز ہیں۔

یہ مضمون پڑھنے والے مشکل سے یقین کریں گے کہ مولانا صلاح الدین احمد
ڈبلیو زیڈ احمد (وحید) کے بھائی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ مجھے معلوم
نہیں یہ دو بھائی ایک دوسرے سے ملتے ہیں یا کہ نہیں۔ لیکن ان دونوں
میں ایک مماثلت ضرور ہے کہ خوشامد پسند ہیں۔

بات شالیمار اسٹوڈیوز کے قیام کی ہو رہی تھی۔ لیکن میں یہاں
آپ سے ایک اور بات عرض کرنا چاہتا ہوں جو بہت ضروری ہے
کہ (احمد) (ڈبلیو زیڈ) سندھ کے مشہور وزیر اعظم غلام حسین ہدایت اللہ
کی لڑکی سے بیاہا ہے مجھے ٹھیک معلوم نہیں ان کا رشتہ وہاں کیسے ہوا۔ ان
تفصیلات کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔

آج سے ایک ماہ پہلے احمد جب ہال روڈ پر اپنے بال کٹوانے آیا
تو میری اس سے ملاقات ہوئی۔ میں اس حجام کے قریب ہی رہتا ہوں لہٰذا
میں اس کو زبردستی اپنے مکان میں لے آیا اور اس سے کہا میں بنتا

کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے اس کی اجازت دیتے ہو؟"
اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا "میں آپ کو ایک دو روز میں بتا دوں گا۔"

کئی روز گذر گئے۔ اس کے بعد احمد سے میری ملاقات "ڈائرکٹر" کے دفتر میں ہوئی۔ میں نے پھر اس سے پوچھا کہ اب اجازت دینے میں کتنے روز چاہئیں۔ اس کے پائپ لگے ہونٹوں پر اس کی مخصوص مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ نیم گنجا سر ذرا چمکنے لگا۔ اور اس نے کہا "میں آج کل بہت مصروف ہوں — بس ایک ہفتے کی مہلت چاہتا ہوں۔"

چوہدری فضل حق صاحب (ڈائرکٹر کے مالک) اور شباب صاحب (ڈائرکٹر کے مدیر) بیٹھے تھے۔ میں نے کہا "بہت بہتر ہے۔ ایک ہفتہ گذرنے میں کیا دیر لگتی ہے۔"

دو ہفتے گذر چکے مگر مجھے احمد سے اجازت نہیں ملی۔ میں نے سوچا کہ ایسے تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہر ایکٹر اور ایکٹرس لکھنے والا اور دیکھنے والی عوام کی ملکیت ہوتی ہے اگر تم ان کے متعلق لکھنا چاہو تو بغیر اجازت لکھ سکتے ہو۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے یہ مضمون لکھنا شروع کر دیا۔

شالیمار اسٹوڈیو قائم ہو گیا۔ مینا یعنی شاہدہ کا خاوند وہاں کی لیباریٹری

کا انچارج بنا دیا گیا۔ اب جو کچھ میرے علم میں ہے آپ سے بیان کرتا ہوں۔

شاہدہ کو ایکٹریس بننے کی کوئی خواہش نہیں تھی وہ بڑی گھریلو قسم کی عورت تھی۔ اس کو کسی قسم کا ہنگامہ پسند نہیں تھا۔

اچھا اب آپ یہ بھی سن لیجئے۔ احمد جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں بڑا اندازہ گیر تھا۔ اس نے روسیوں کی طرح ایک پنج سالہ سکیم بنائی اور اس کے ماتحت کام کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں اس نے اپنے مخصوص گھبرائے پن سے کام لیا۔ یہ بڑی لمبی داستان ہے۔ میں اسے بیان نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے کہ اس مضمون میں اس سے کوئی زیادہ اثر پیدا نہیں ہو سکے گا۔

محسن سنہیہ پرتھا پردھان کے عشق میں مصروف تھا۔ جب مالی مشکلات پیدا ہوئیں تو اس نے اپنی بیوی شاہدہ سے کہا "تم بڑی بیک ورڈ ہو۔ میری بہنوں کی طرف دیکھو کتنی روشن خیال ہیں۔"

شاہدہ نے غالباً اس سے کہا "مجھے معاف کیجئے۔ میں اتنی روشن خیال نہیں ہو سکتی۔"

ان کے درمیان کئی جھڑپیں ہوئیں۔ محسن چاہتا تھا کہ وہ فلم لائن میں داخل ہو جائے۔ مگر اس کو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔

عصمت چغتائی نے (اب عصمت شاہد لطیف جو ضدی، آرزو،

اور بزدل جیسے کامیاب فلموں کی کہانی لکھ چکی ہے، میری بیوی سے کہا کہ شاہدہ علی گڑھ میں اس کی ہم جماعت رہ چکی ہے۔ بڑی اچھی عورت ہے بہت سادہ لوح"۔

"میری بیوی بڑی حیران ہوئی۔ اس نے عصمت سے پوچھا" یہ رائے تم نے کیسے قائم کی؟

"میری سہیلی ہے۔ میں اس کو اچھی طرح جانتی ہوں"

"تمہاری میرے متعلق کیا رائے ہے"؟

عصمت نے جواب دیا "تم تو نری کھری عورت ہو"

"اس میں کیا عیب ہے"

"کچھ بھی نہیں —— لیکن تم شاہدہ سے بہت زیادہ مختلف ہو"——

"کس لحاظ سے"؟

"وہ بیوقوف ہے۔ تم بیوقوف نہیں ہو۔ تم اپنے خاوند کو سنبھالنا جانتی ہو۔ اس کو اپنے خاوند کو سنبھالنا نہیں آتا"

"یہ تم کیسے کہتی ہو"؟

"میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس کے سارے گھرانے سے واقف ہوں۔ بہت سیدھی سادی سی لڑکی تھی ہم

کالج میں اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے ۔ وہ جھینپ جھینپ جایا
کرتی تھی ۔"

عصمت نے میری بیوی کو بتایا کہ اسے عشق و محبت کے متعلق کچھ
معلوم نہیں تھا۔ اس کو حیرت تھی کہ وہ کیسے محسن کی محبت میں گرفتار ہوگئی
اس کا خیال تھا کہ محسن کچھ زیادہ ہی اس کے پیچھے پڑ گیا ہوگا۔ کہ وہ
رضامند ہوگئی۔ اس لئے کہ وہ طبیعت کے لحاظ سے بہت نرم ہے اسے
اس بات کا کوئی خیال نہیں ہوتا کہ آگے چل کر کیا ہوگا۔

محسن نے جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا شاہدہ کو مجبور کیا کہ وہ فلم
ایکٹریس بن جائے۔ وہ بادل ناخواستہ رضامند ہوگئی۔ چنانچہ اس کے
ناتواں کاندھوں پر شالیمار اسٹوڈیوز تعمیر کر دیا گیا ۔ اور احمد (ڈبلیو زیڈ)
ایک پروڈیوسر بن گیا ۔ اس نے شاہدہ کو پُراسرار مینا بنا دیا۔ معلوم
نہیں یہ نام احمد نے اس کے لئے تجویز کیا تھا یا اس کے شوہر محسن نے ؟

احمد نے فلم بنانے سے پہلے اس پُراسرار مینا کی بڑی تشہیر کی۔
ہر پرچے میں یہ نام دیکھنے میں آتا ۔ لوگوں کے دلوں میں بڑا اشتیاق
پیدا ہوگیا کہ یہ کون سی آفت جان ہے ۔ چنانچہ اس فلم کا بڑی بے چینی
سے انتظار کیا جانے لگا ۔ اس کا نام "ایک رات" تھا۔ معلوم نہیں اس
کی تکمیل میں کتنی راتیں اس نے کاٹی ہوں گی بہر حال وہ بن گئی۔

اس فلم کی کہانی مشہور ناول "لٹس" کا چربہ تھا۔ اس میں شاہدہ (پُراسرار بینا) کو گرل کا رول دیا گیا تھا۔ ایک شخص اس کی عصمت لوٹ لیتا ہے۔ اس کے بعد اس کی باقاعدہ شادی ہو جاتی ہے۔ وہ بڑی بھولی بھالی ہے۔ اپنے خاوند سے اپنی گزشتہ زندگی کے اس حادثے کو بیان کر دیتی ہے۔ وہ اس کو دھتکار دیتا ہے۔

احمد (ڈبلیو۔ زیڈ) اپنی پنج سالہ اسکیم کے ماتحت شاہدہ سے کچھ اس طرح مل رہا تھا۔ جس طرح مالوٹوف کسی دوسرے سفیر سے مل رہا ہے۔

شاہدہ کا خاوند محسن اپنی سرگرمیوں میں مشغول تھا۔ اس کے ناکام عشق کا سلسلہ سنیہہ پربھا پردھان سے بدستور تھا۔ شاہدہ سے اس کو کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ یہ میں اس زمانے کی بات کر رہا ہوں جب شالیمار اسٹوڈیو قائم نہیں ہوا تھا۔

اس زمانے میں (مجھے افسوس ہے کہ میں یہ مضمون غیر مسلسل لکھ رہا ہوں۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں۔ اس لئے کہ خیالات جیسے دماغ میں آتے ہیں۔ میں قلم بند کئے جاتا ہوں) احمد جو محسن کے دوست بن گئے تھے۔ شاہدہ کو بیگم کہتا۔ اس کی ضرورت سے زیادہ تعظیم کرتا جب وہ آتی تو احمد کھڑا ہوتا۔ اور اسے تسلیمات عرض کرتا۔ احمد نے یہ رویہ سوچ سمجھ کر اختیار کیا تھا۔ اس لئے کہ وہ محسن کی بے پروائی کا تقابل بنتا

چاہتا تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا ۔۔۔ وہ بڑا دقیقہ شناس تھا کہ وہ شاہدہ کو ایک دو برس میں نہیں تو کم از کم پانچ برسوں میں ضرور حاصل کر سکے گا۔

اب میں آپ سے عرض کر دوں کہ فلمی دنیا میں اکثر و بیشتر حضرات عورتوں کے ذریعے سے کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کے پیشِ نظر بھی غالباً یہی نسخہ تھا۔ احمد نے اس پر چھا جانے کے لئے کافی وقت صرف کیا۔ اس کے خاوند محسن عبداللہ کو ہر سمت سے خوش کرنے کی کوشش کی، مگر وہ طبعاً خوش باش تھا۔

شالیمار اسٹوڈیوز میں جب محسن کو لیبارٹری انچارج بنا دیا گیا اور اس کی معقول تنخواہ مقرر کر دی گئی تو اس نے اپنے شغل اور زیادہ زور شور سے جاری رکھے۔ شاہدہ یہ سب کچھ ایک گھریلو عورت کے مانند دیکھتی رہی۔ کبھی کبھی گلہ شکوہ کرتی، مگر اس کے خاوند پر جو تن آسان تھا۔ کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس کو بمبئے ٹاکیز کی گھٹی گھٹی فضا سے باہر نکل کر شالیمار اسٹوڈیو میں ایک بہت بڑا میدان مل گیا تھا۔ جس میں وہ اپنے اشغال میں بڑی بے تکلفی سے مصروف رہ سکتا تھا۔

شاہدہ گویا ایکٹرس بن گئی تھی۔ اسے اس گوالن کا رول ادا کرنا تھا۔ جس کی عصمت لوٹ لی گئی تھی۔ لیکن اسے اپنے شوہر سے پیار تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ فلمی دنیا سے نکل کر گھریلو دنیا میں چلی جائے۔ اسے یہ امر نہ کھلاتا

پسند نہیں تھا۔

لیکن جب اس کے متعلق اشتہار بازی ہوتے دو برس ہو گئے تو اس کے ننھے سے گھروندے میں جس کو دل کہتے ہیں، عجیب عجیب سی دھڑکنیں پیدا ہونے لگیں۔ جن سے وہ پہلے نا آشنا تھی۔

اس کے سامنے جو تقابل احمد نے پیش کیا۔ وہ اس کے متعلق اب سوچنے لگی۔ وہ آداب کا مجسمہ تھا۔ اس کے خلاف محسن بہت تکلیف دہ قسم کا بے ادب وہ اس سے بہت برا سلوک کرتا۔ اس کے علاوہ شاہدہ کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ اسٹوڈیو میں دوسری عورتوں سے عشق لڑاتا پھرتا تھا۔

احمد نے محسن کو جس عہدے پر فائز کیا تھا۔ وہ اسے اس کی اسکیم کے مطابق سنبھال نہ سکا۔ اس نے محسن کو کبھی ٹوکا نہیں تھا۔ کہ وہ جوا کیوں کھیلتا ہے۔ ریس میں روپیہ کیوں ہارتا ہے۔ اسٹوڈیو کی لڑکیوں سے کیوں دلچسپی لیتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ بری طرح وہ ان خرابیوں میں گرفتار ہو جائے۔ اس لئے کہ وہ خود ایک بہت بڑی خرابی کے درپے تھا۔

احمد کی اسکیم میں جو کچھ تھا وہ ظاہر ہے۔ لیکن بھولی بھالی شاہدہ اسے نہ سمجھ سکی۔ وہ اپنے دل کی عجیب و غریب دھڑکنوں کو بھی نہیں سمجھتی تھی۔ میک اپ کرتی۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھتی اور شرما جاتی۔ اسے

یوں محسوس ہوتا کہ وہ گالز وردی کے ناول "ٹیس" کی گوالن ہے۔ جس کی عصمت لوٹی جانے والی ہے۔

اس نے جب فلم میں اپنا رول ادا کرنا شروع کیا تو اس کا حجاب کسی قدر دُور ہو گیا ـــــ محسن اسی قدر اس سے دور ہوتا گیا۔ وہ یوں محسوس کرنے لگی۔ کہ اس کے سچے مٹکے تڑخ رہے ہیں ـــــ۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ قیمتی مٹکے ٹوٹیں۔ لیکن احمد نے ان کی تریڑوں کو یقین دلایا کہ وہ خود بخود ٹھیک ہو جائیں گی۔

تریڑیں آہستہ آہستہ ٹھیک ہونے لگیں۔ اس لئے کہ احمد ایسے معاملوں میں بڑا ماہر کاریگر ہے۔ اس نے ان میں اپنی سیاست کا سیمنٹ بھرنا شروع کر دیا ـــــ اس کے ساتھ ساتھ وہ محسن کے بھی چونہ لگا رہا تھا۔

احمد بڑا اچھا معمار ہے۔ اس نے اپنا کام بہت آہستہ مگر بڑی صفائی سے کیا۔ آخر وہ محسن کی اینٹ کو اپنی عمارت سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس نے اس دوران میں شاہدہ کو یقین دلا دیا تھا کہ اس کا شوہر ایک عیاش اور ناکارہ آدمی ہے۔ اس نے اس کو محض اس لئے اپنے کاروبار میں شریک کیا تھا کہ اس کی عادات سدھر جائیں گی۔ مگر وہ اس قابل ثابت نہیں ہوا۔

شاہدہ یہ سب باتیں سنتی رہی اور اس کو یقین سا آنے لگا کہ شاید
یہ درست ہیں۔ لیبارٹری کا کام بہت سست رفتار تھا۔ خود احمد بھی
چیونٹی کی چال چلنے کا عادی ہے لیکن ایک دن اس نے محسن سے بڑی
نرمی سے کہا "دیکھیے، آپ سے کام نہیں ہوتا۔ شاید اس لیے کہ آپ
اسے اپنے رتبے کے مطابق نہیں سمجھتے۔ میں لیبارٹری کسی اور کے حوالے
کر دیتا ہوں۔ جو تنخواہ آپ کی مقرر کی گئی تھی برابر آپ کو ملتی رہے گی۔"

محسن پہلے تو سخت طیش میں آ گیا۔ لیکن اس کی یہ آگ فوراً احمد
نے بجھا دی اس لیے کہ وہ بڑا اچھا فائر بریگیڈ ہے۔ چنانچہ شاہدہ کا خاوند
ملازمت سے علیحدہ ہو گیا اور اسے پنشن ملنے لگی۔

میں محسن کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ بیک وقت ذکی الحس اور
بے حس ہے اس وقت شاید اس پر بے حسی طاری تھی کہ اس نے احمد
کا یہ فیصلہ قبول کر لیا۔

اس کو اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا کہ اس کی بیوی جس سے
وہ غفلت برت رہا ہے اور جس کو اس نے مجبور کیا ہے کہ وہ اس کی
بہنوں کی طرح آزاد ہو۔ اس کی مانگ میں کوئی اور ہولے ہولے "سیندور"
ڈال رہا ہے۔ وہ قطعاً غافل تھا۔ اس کو دراصل اپنی بیوی سے
زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس کو بمبئی اور پونہ کے گھوڑوں، تاش کے پتوں اور

پُرنے کے کاشٹوں سے شغف تھا۔

فلم بن رہا تھا۔ شاہدہ گوالن بنی ہر اسرار دنیا کے نام سے اس میں کام کرنے میں دن رات معروف تھی اور احمد ڈائریکٹر کی حیثیت سے اس کو ایسی ڈائرکشن دے رہا تھا جو اس کے مقصد کو پورا کر سکے۔

محسن عبداللہ کالی وجیہہ مرد ہے۔ لم تڑنگ مضبوط جسم۔ تعلیم یافتہ مگر ضرورت سے زیادہ روشن خیال۔ اس نے شالیمار اسٹڈیوز سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنی بیوی کی مفارقت کے متعلق جس سے اس نے عشق کے ماتحت شادی کی تھی کچھ زیادہ خیال نہ کیا۔ اسے شاہدہ پر کامل اعتماد تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے اس کی کوئی پرواہ بھی نہیں تھی۔ وہ اب آزاد تھا اور اس آزادی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

ڈبلیو۔ زیڈ احمد بڑا دھندا دار آدمی ہے۔ وہ اپنے عملے کے دوسرے آدمیوں کو اگر وقت پر تنخواہ نہ دے سکتا تو محسن کو اس کی پنشن مقررہ وقت پر ضرور ادا کر دیتا۔ یہ اس کے کیریکٹر کا ایک خاص پہلو ہے۔ وہ چھچھورا یا کمینہ نہیں۔ اس میں ایک اعلیٰ خاندان کے فرد کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ لیکن سوئے اتفاق سے وہ چونکہ فلمی دنیا میں داخل ہو گیا تھا۔ اور اس کی طبیعت سراسر سیاسی تھی۔ اس لئے اسے اس ماحول کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑا۔ اس کے پاس کوئی سرمایہ نہیں تھا لیکن اس نے ناکھول

روپے سمیٹے۔ ان کو اس نے کسی عیاشی میں تباہ نہیں کیا۔ دراصل وہ بڑا سہل انگار اور سست رفتار ہے۔ اس کے علاوہ خوشامد پسند بھی اور وہ بڑے چھوٹے پیمانے پر ایک مغل بادشاہ ہے جو اپنے ارد گرد شاعروں، بھانڈوں اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں کا جمگھٹا لگائے رکھتے تھے۔

جیسا کہ میں شاید اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں۔ اس کے ہاں ساغر نظامی، جوش ملیح آبادی، جاں نثار اختر، کرشن چندر ایم اے اور بھرت ویاس ملازم تھے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور میرا بھانجہ مسعود پرویز بھی تھے۔ یہ سب احمد کے مکان کے ایک کمرے میں بیٹھتے۔ کہانی کے مکالموں پر بڑی گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ ساری رات گذر جاتی اور کوئی فیصلہ نہ ہوتا اس لئے کہ درباری ماحول ہوتا تھا۔ کوئی بات شروع ہوئی تو جوش ملیح آبادی نے موقع محل کے مطابق شعر سنانے شروع کر دیئے۔ واہ واہ ہو رہی ہے۔ مسعود پرویز جس کا دماغ اس زمانے میں حاضر تھا۔ فوراً اسی زمین میں چند شعر کھود ڈالے ساغر نظامی کو تاؤ آیا تو اس نے ایک لمبی نظم ترنم میں پڑھ دی۔ کرشن چندر آلو بنا بیٹھا رہتا، افسانہ نگار تھا۔ اس کو شعروں سے بھلا کیا واسطہ۔

ان نشستوں میں کام بہت کم ہوتا۔ باتیں بہت زیادہ ہوتیں۔ بھرت ویاس کو یہ احساس کمتری تھا کہ وہ اردو زبان نہیں جانتا۔ اس لئے

وہ اپنی سنسکرت آمیز ہندی بگھارنا شروع کر دیتا۔

کبھی کبھی احمد جب کوئی موزوں فقرہ بولتے تو جوش ملیح آبادی عش عش کرنے اور کہتے " احمد صاحب آپ تو شاعر ہیں"۔ بس احمد صاحب اس وقت اپنا کام بھول جاتے اور شعر فکر کرنے لگتے۔ محفل برخاست کر دی جاتی اور وہ ساری رات غزل کی تکمیل میں مصروف رہتے اور جو میرا خیال ہے آج تک ایک بھی مکمل نہیں ہوئی۔

یہ سب لوگ احمد کے خوشامدی تھے جوش ملیح آبادی کو ہر شام رم کا آدھا مل جاتا تھا۔ شروع شروع میں شالیمار اسٹوڈیو میں چند مہینوں تک باقاعدہ تنخواہیں ملتی رہیں۔ اس کے بعد بے قاعدگی شروع ہو گئی۔ عملے کے آدمی صرف ایڈوانس لیتے تھے۔

وہاں کی فضا عجیب و غریب تھی۔ ڈائرکٹر ایک تھا۔ مگر اس کے اسسٹنٹ دس بارہ کے قریب تھے۔ اسسٹنٹ کے اسسٹنٹ اور در اسسٹنٹ معلوم نہیں یہ لوگ گذارہ کیسے کرتے تھے اس لئے کہ تنخواہ تو وقت پر ملتی ہی نہیں تھی۔

بہرحال یہ احمد کا معجزہ ہے کہ اس نے شالیمار اسٹوڈیو کا بھرم کسی نہ کسی طرح قائم رکھا ہوا تھا۔ وہ بڑا کائیاں انسان ہے۔ اس کو مشکل سے مشکل وقت بھی پریشان نہیں کر سکتا۔ بڑے اطمینان سے چاندی کی

ڈبیا میں سے پان نکالے گا۔ بٹوے میں سے چھالیا اور تمباکو نکال کر کلّے میں دبائے گا اور مسکرانا شروع کر دے گا۔

اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو کسی پرکار سیاست دان میں ہو سکتی ہیں۔ اس نے اسی سیاست کی بدولت شالیمار اسٹوڈیو بنایا اور آہستہ آہستہ اپنا رستہ ناپ کر شاہدہ پر قبضہ کر لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو شاہدہ میں ایسی کیا کشش دکھائی دی کہ اس نے اس کے سٹاپ جسم پر ایک نگار خانہ تعمیر کر دیا۔ وہ ایسی عورت ہی نہیں تھی جو ایکٹرس بننے کے قابل ہو مگر شاید احمد کو اس وقت کوئی اور لڑکی میسر نہیں تھی یا آسانی سے ہاتھ نہیں لگ سکتی تھی کہ اس نے اپنے دوست محسن کی بیوی سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی اور بعد میں وہ اس کے گھریلو پن سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔

لیکن یہ امر بھی مشتبہ ہے، ہو سکتا ہے احمد کو شاہدہ سے کبھی محبت نہ ہوئی ہو۔ محض اپنے مفاد کی خاطر جب وہ اس پر لگاتار اپنی شرافت کا بوجھ ڈالتا رہا تو وہ اپنے خاوند محسن عبداللہ کو بھول گئی۔ مگر یہ نظریہ بھی درست نہیں، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ طلاق ہونے تک وہ اپنے شوہر سے جدا ہونا پسند نہیں کرتی تھی۔ میں اس کے متعلق آگے چل کر کچھ عرض کروں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ شاہدہ، احمد کے

سائرہ کہاں رہتی تھی۔ ٹھہریئے ——— میں بھول گیا۔ شروع شروع میں وہ دونوں الگ الگ رہتے تھے۔ لیکن بعد میں ایک ہی کوٹھی میں رہنے لگے۔

جانے کون سا سن تھا۔ میں فلمستان میں ملازم تھا۔ ایس مکرجی یہاں کے پروڈکشن کنٹرولر تھے۔ انھوں نے ایک روز مجھ سے کہا کہ تم کہانی کیوں نہیں لکھتے ہو۔ میں نے چنانچہ پانچ دن میں چار کہانیاں لکھیں۔ مکرجی صاحب نے مجھ سے کہا کہ مجھے سناؤ۔ میں نے صاف انکار کر دیا اور چاروں کہانیاں اپنے بھانجے مسعود پرویز کو بھیج دیں جو شالیمار اسٹوڈیو میں ملازم تھا۔

پہلی کہانی "کنٹروستان" تھی۔ مجھے چوتھے روز مسعود کا تار ملا کہ تمھاری یہ کہانی بہت پسند کی گئی ہے۔ بہتر ہے کہ تم پونہ چلے آؤ تاکہ احمد صاحب سے جملہ معاملات طے ہو جائیں۔

میں پونہ گیا۔ اب یہ ایک لمبی حکایت ہے کہ میں وہاں کس طرح پہنچا۔ میں نے شالیمار اسٹوڈیو میں کیا کچھ دیکھا۔ صرف ایک دلچسپ بات بتائے دیتا ہوں کہ سب سے پہلے میں اس اسٹوڈیو کی موتری (پیشاب خانے) میں گیا۔ کیونکہ یہ ایسی جگہ ہے جہاں سے متعلقہ فضا کے اکثر و بیشتر حالات معلوم ہو جایا کرتے ہیں۔

میں جب اندر داخل ہوا تو سامنے دیوار پہ اُردو زبان میں جملہ لکھا تھا یہ "اور تو سب ٹھیک ہے پر یہاں پگار (تنخواہ) نہیں ملتی ہے" میں بڑا بددل ہوا — میں نے سوچا کہ واپس چلا جاؤں لیکن مسعود نے مجبور کیا کہ احمد سے مل لوں۔ شام کو اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ دفتر میں ——— یہ بڑا سگار سلگائے اپنی کرسی پہ بیٹھا تھا۔ ایک طرف شاہدہ وقتی۔ دوسری طرف جوش ملیح آبادی۔

جوش سے علیک سلیک ہوئی۔ ان کے پاس اِن کھلا رم کا ادھا تھا جو غالباً احمد نے احتراماً منگوا کر دیا تھا۔ احمد سے میں نے پنجابی میں گفتگو شروع کی۔ لیکن فوراً مجھے احساس ہوا کہ پاس جوش اور شاہدہ بیٹھے ہیں جو یہ زبان نہیں سمجھتے اس لئے میں نے اردو میں بات چیت شروع کر دی۔

میں نے جب اسے پربھات فلم کمپنی میں دیکھا تھا تو وہ ترو تازہ نوجوان تھا۔ پر اب اس میں بڑی تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ لو چلنے کے باعث جھلس سا گیا ہے۔

اس نے اپنے مخصوص رسمی انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا تھا اور شاہدہ عرف پاسرار نینا سے بھی متعارف کیا تھا۔ وہ اس وقت وہیں دفتر میں موجود تھی۔

اس کی شکل وصورت میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس میں کوئی اسرار پوشیدہ ہو۔ معمولی خدوخال کی عورت تھی۔ میں نے جب اسے پہلی مرتبہ احمد کے دفتر میں دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ آبی رنگوں کی ایسی تصویر ہے جو بارش میں چھت ٹپکنے کے باعث اپنے رنگ کھو چکی ہے۔

اس میں ایکٹرسوں کی ایکٹریسیت نہیں تھی۔ خاموش ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں کون ہوں۔ وہ یہ بھی جان گئی تھی کہ میں اس کے شوہر محسن عبداللہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔

تھوڑی دیر جوش ملیح آبادی سے گفتگو ہوتی رہی۔ وہ اپنا شام کا کوٹا۔ یعنی رم کا آدھا ہاتھ میں تھامے بیٹھے تھے اور احمد مشہور جرمن فلم ڈائرکٹر کی نقل اتار رہا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ ایک لمبا سگار ہونٹوں میں دبائے بیٹھا تھا۔

میں وہاں اپنی ایک کہانی بیچنے کے سلسلے میں گیا تھا۔ اس کے متعلق اس دن کوئی بات نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ میں نے پُر اسرار نینا کو دیکھ لیا تھا۔

فلمستان میں، میں نے محسن عبداللہ کو بھی ملازم رکھوا دیا تھا۔ اس کی حالت بہت پتلی تھی۔ ایک دن میں نے پروڈکشن کنٹرولر مسٹر مکرجی

سے کہا کہ وہ بمبئی ٹاکیز کے زمانے میں اس کا دوست رہ چکا ہے۔ اس کو شرم آنی چاہیئے کہ وہ غریب کس مپرسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہا ہے۔

مکرجی نے دوسرے روز ہی اسے بلایا۔ آپس میں دوستانہ گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد مکرجی نے دوستانہ طور پر اس سے کہا کہ وہ فلمستان میں کیوں نہیں آجاتا۔ وہ راضی ہو گیا۔ اس کی تنخواہ چار سو روپے ماہوار مقرر ہو گئی۔

محسن عبداللہ بڑا کام چور ہے۔ اس کو کام کرنے کی عادت ہی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ دوسرا اس کے لئے کمائے اور وہ کھائے۔

ان دنوں "آٹھ دن" بن رہا تھا۔ جس کی کہانی میری لکھی ہوئی تھی۔ اس کا منظر نامہ میں جب لکھنے لگا۔ تو محسن نے مجھ پر بڑے احسان کئے۔ مجھے کئی مشورے دیئے۔ جو فلمی نقطہ نظر سے بالکل غلط تھے۔ میں نے ان کو نظر انداز کر دیا۔

اس دوران میں وہ مجھے بتا چکا تھا کہ اس کو شاہدہ کی محبت اب بھی ستاتی ہے۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ ایک لڑکی سے (جو عورت بن چکی تھی) جس کا نام ویرا تھا۔ اور جسے ہم نے "آٹھ دن" کی ہیروئن منتخب

کیا تھا۔ اپنا تانگہ چلا رہا ہے۔

شروع شروع میں وہ سیکنڈ کلاس میں سفر کیا کرتا تھا۔ برقی ٹرین میں تین درجے ہوتے ہیں تھرڈ سیکنڈ اور فرسٹ، فلمستان شہر سے کافی دور تھا۔ غالباً اکیس میل۔ یہ مسافت طے کرنے میں کم از کم پون گھنٹہ لگتا تھا۔ لیکن جب رائے بہادر چونی لال نے فلم "آٹھ دن" کے لئے ویرا کے ساتھ کنٹریکٹ کیا تو اس نے فرسٹ کلاس میں آنا جانا شروع کر دیا۔

میرا خیال ہے کہ اب اس سلسلہ خیال کو یہیں بند کر دینا چاہیئے اور اصل موضوع کی طرف آنا چاہیئے۔

میں اشوک کے دفتر میں بیٹھا ایک ایرانی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ پر اسرار بینا بیٹھی تھی لیکن میرے نزدیک ان دونوں میں کوئی پراسرار "مسرت" نہیں تھی۔

یوں تو پر اسرار بینا میرے لئے بالکل اجنبی اور نئی تھی لیکن اس کے باوجود میں یہ سمجھتا تھا کہ میں اس کو اس کی پیدائش سے جانتا ہوں جیسا کہ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں۔ وہ بڑی گھر یلو قسم کی عورت ہے ہے یا دکھائی دیتی ہے۔

میرے دل و دماغ میں بے شمار خیالات تھے اس لئے کہ میں حسن عبداللہ

کا دوست بن گیا تھا، اس نے مجھ سے اپنی زندگی کے واقعات کچھ اس انداز میں بتائے تھے کہ میں ایک سادہ لوح ہونے کی وجہ سے متاثر ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا۔ اس کی بیوی شاہدہ کو اس سے بتدریج چھینا گیا ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک خاوند سے اس کی موجودگی میں بتدریج یا نا تدریج کیسے چھینا جا سکتا ہے۔

اصل میں وہ اس سے غافل تھا۔ اور سنہرہ پر بھا پردھان کے عشق میں مبتلا تھا۔ اس کے علاوہ اس کو جوئے بازی کا بھی شوق تھا فلش کھیلتا اور اکثر ہارتا۔

اس کو اپنی بیوی سے ہمیشہ یہ گلہ رہتا کہ وہ اس کی بہنوں کی طرح آزاد نہیں ہے۔ وہ عزیب فلمی ماحول سے قطعاً آشنا ہونا نہیں چاہتی تھی۔ دل ہی دل میں کڑھتی تھی کہ اس کا خاوند جو فلم لیبارٹری میں کام کرتا ہے کیوں اسے مجبور کر رہا ہے کہ وہ فلم ایکٹرس بن جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہدہ ایک اونچے روشن خیال اور بیباک خاندان کی فرد تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس میں حجاب بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس نے شروع شروع میں اپنے خاوند محسن عبداللہ سے یہ شکایت کی کہ وہ کیوں ایک ایکٹرس سے عشق لڑا رہا ہے۔ کیوں جوا کھیلتا ہے۔ اور بیکار روپیہ ضائع کرتا ہے۔ مگر محسن عبداللہ نے اپنی بیوی کی کوئی

بات نہ سنی۔

ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد ان کے گھر بدستور آتا رہا۔ وہ اس کا اتنا احترام کرتا تھا کہ وہ سمجھتی تھی کہ وہ اس احترام کے قابل نہیں۔ اس کو آہستہ آہستہ یہ محسوس ہونے لگا کہ احمد جس کے ساتھ ڈبلیو۔ زیڈ چپکا ہوا ہے کوئی ایسا مرد ہے جو محسن کے مقابلے میں اس پر زیادہ جنسی احسان کر سکتا ہے۔

محسن مس پردھان کے چکر میں پڑا تھا۔ میں آپ کو یہاں بتا دوں کہ مس پردھان بڑی قبضہ گیر قسم کی عورت ہے اور محسن جو اپنی بیوی کو قریب قریب چھوڑ چکا تھا۔ اس کے پیشِ نظر وہ اس کے بارے میں کیا رائے قائم کر سکتی تھی؟ ظاہر ہے کہ ان کے رومان کا انجام ناکام رہا۔

معاف کیجئے گا کہ میں بہک گیا۔ اور باتوں ہی باتوں میں خدا معلوم کہاں پہنچ گیا۔ ویسے آپ سے عرض یہ کرنا تھا کہ احمد کے دفتر میں جب نینا سے میری ملاقات ہوئی تو میں حسبِ معمول پیئے تھا اور جب میں پیئے ہوتا ہوں تو مجھے تکلف برتنا نہیں آتا۔ چنانچہ میں نے پُر اسرار نینا سے کہا کہ "آپ کا اسرار تو میں نہیں جانتا۔ اس لئے کہ وہ ڈبلیو۔ زیڈ احمد کے پاس محفوظ ہے لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ آپ نے اپنے شوہر کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔"

یہ سن کر ڈبلیو۔ زیڈ احمد نے میری طرف دیکھا اور یہ معذرت کر کے

کہ اسے کسی سے باہر ملنا ہے چلا گیا اور ساتھ جوش ملیح آبادی کو بھی لے گیا۔ ایسے معاملوں میں ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد کا کوئی جواب نہیں۔ وہ ہر رمز اور ہر کنایہ پہچانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تحصیلانہ اسکیم کے ماتحت نینا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جس کو اس نے پُراسرار بنا دیا۔ اصل میں اسرار سارا احمد کا ہے جس نے اسے ایک موٹی کبوتری بنا کر رکھ دیا ہے جو صرف اسی کے گھر میں انڈے دیتی ہے۔

ایک انڈا اس نے محسن کے گھر میں بھی دیا تھا جس کا چوزہ صحت مند نہیں تھا۔ ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد کی کاریگری ہے یا آپ اسے کوئی اور نام دے دیجیے کہ وہ اب تک اسے پالتا پوستا ہے۔

میں نے احمد کے چلے جانے کے بعد نینا سے سلسلۂ گفتگو کا آغاز کیا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ تمہاری یاد میں اکثر آنسو بہاتا ہے۔ یہ سن کر اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر ایک عجیب سی طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی: "منٹو صاحب آپ اس شخص کو نہیں جانتے اس کا ہر آنسو انگریزی کے محاورے کے مطابق مگرمچھ کا آنسو ہوتا ہے وہ آنسو نہیں بہاتا بلکہ آنسو اس کو بہاتے ہیں۔"

یہ جملہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ بہرحال شاہدہ عرف پُراسرار نینا کی بے اثر سنجیدگی یہ ظاہر کئے دیتی تھی کہ جو کچھ اس نے کہا ہے اس میں دروغ کی

گنجائش نہیں ہو سکتی۔ آن دنوں "میرا بائی" کی تیاریاں ہو رہی تھیں اس کے علاوہ "کرشن بھگوان" کے لئے احمد نے حسب دستور پنچھالہ اسکیم کے ماتحت بھارت بھوشن کو کرشن بھگوان کا پارٹ ادا کرنے کے لئے زیر معاہدہ کر رکھا تھا۔

بھارت بھوشن کو ہر روز باقاعدگی کے ساتھ مکھن اور دوسری مقوی غذائیں کھلائی جاتی تھیں۔ کہ وہ بہت دبلا تھا اور اس قابل نہیں تھا کہ مکھن چور بن سکے۔

بھارت بھوشن کو مکھن کھلانے کے ساتھ ساتھ احمد، شاہدہ کے اسرار میں اضافہ کرتا گیا جو اس کے پروگرام کے عین مطابق تھا۔

اب میں احمد کی سنہرے جلوے کی بیاہی بیوی کی طرف آتا ہوں جس کا نام صفیہ ہے۔ غلام حسین ہدایت اللہ (مرحوم) وزیر اعظم سندھ کی دختر نیک اختر۔

ظاہر ہے کہ جب خاوند کسی دوسری عورت کے ساتھ مصروف ہوگا تو اس کی اپنی عورت جو روشن خیال اور آزاد ہو۔ یقیناً کسی نہ کسی سے رابطہ پیدا کرلے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ مشہور کمیونسٹ لیڈر سبط حسن سے اس کا معاشقہ ہو گیا۔

مجھے اس رومان کے متعلق پوری معلومات حاصل نہیں تھیں۔ اس لئے

میں نے سبطِ حسن سے یہاں لاہور میں کئی ملاقاتیں کیں۔ لیکن اُس سے مکمل کر بات نہ کر سکا۔ ہر روز یہی سوچتا کہ دوسرے روز جب وہ آئیگا یا جب میں اُس سے ملوں گا۔ تو احمد کی بیوی کے بارے میں دریافت کروں گا۔ کہ یہ سلسلہ کیسے ہوا۔ کیونکہ میں نے سُنا تھا۔ کہ صفیہ جو کافی پڑھی لکھی عورت ہے امریکہ کسی علمی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے گئی اور سبطِ حسن بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ اور ان دونوں کی شادی ہوگئی۔

میں یہ مضمون ضرور مکمل کرتا جو کسی لحاظ سے بھی تشنہ نہ رہتا لیکن اچانک حکومت کی مشینری حرکت میں آئی اور سبطِ حسن گرفتار کر لئے گئے۔ اس لئے کہ وہ کمیونسٹ ہیں۔

گرفتاری سے پہلے ایک شام جب اُن سے ملاقات ہوئی۔ تو وہ اپنے پائپ میں جہاں گیر دستہ تمباکو پی رہے تھے۔ میری یہ خواہش تھی کہ اُن سے کرید کرید کر احمد کی سابقہ بیوی صفیہ کے متعلق پوچھوں۔ کہ اُس سے اُن کا معاشقہ کیسے ہوا۔ اب وہ کہاں ہے سبطِ حسن تین برس جیل میں رہنے کے بعد آئے تھے۔

احمد اور سبطِ حسن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ احمد سیاسی آدمی ہے، سبطِ حسن اس کے برعکس جذباتی۔ اس کو پنج سالہ اسکیمیں پسند نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ جو کام ہو "فٹافٹ" ہو ——

یوں دیکھنے میں بڑے تیکھے ہیں وہ۔ لیکن اندرونی طور پر بہت ملائم۔
گرفتاری سے چند روز پہلے، وہ میرے یہاں تشریف لائے مصیبت یہ تھی کہ میرے اور کئی ملاقاتی موجود تھے۔ ان کی موجودگی میں سبط حسن سے کھل کر باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ باتوں باتوں میں اُن سے میں نے پوچھا:

"سنئے آپ اب کب جیل جائیں گے؟"

سبط حسن نے ایک پائپ کا کش لگایا اور مسکرا کر کہا۔

"چند دنوں میں۔"

اور واقعی وہ پندرہ بیس روز کے بعد جیل میں داخل کر دیئے گئے اور میرا یہ مضمون نامکمل رہ گیا۔

میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ لیکن کیا کروں، یہ موضوع ہی ایسا ہے۔ جو ہزار پہلو ہے۔

شاہدہ (زینبا) کے شوہر محسن عبداللہ ایک بڑی خطرناک لڑکی سنبھہ پر بھا پردھان سے عشق فرما رہے تھے۔ اُن کی بیوی پر احمد صاحب بڑے سلیقے سے اپنی اسکیم کے ماتحت آہستہ آہستہ ڈورے ڈال رہے تھے۔

ادھر ادھر اور بہت کچھ ہو رہا تھا۔ کرنی مسز نورانی تھیں۔ اُن کے ساتھ ایک پنجابی لونڈا عشق لڑا رہا تھا۔ یہ مسز نورانی، احمد کی رشتہ دار تھیں۔ یا مسٹر نورانی کی ـــــ بہر حال کہنا یہ ہے کہ میں نے کئی مرتبہ اُس کو

اُن کے گھر میں جو زرجٹ اسٹریٹ پر تھا، دیکھا۔

وہ پنجابی لونڈا بھی عجیب و غریب تھا معلوم نہیں اُسے کوئی عارضہ تھا، لیکن بظاہر وہ یہی کرتا کہ اُس کو دل کے دورے پڑتے ہیں۔

مسٹر نورانی خاموش کرسی پر سگار سلگائے بیٹھے رہتے اور اُن کی بیگم پنجابی نوجوان کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی رہتی۔ کبھی کبھی بوس و کنار بھی ہو جاتا۔ مگر مسٹر نورانی کے سگار کی راکھ ویسی کی ویسی اُس پر ثابت و سالم رہی۔

عجیب سلسلہ تھا۔ کہ مسٹر عبداللہ، سنبھہ پر بھا پردھان کے عشق کے چکر میں تھے۔ اُن کی بیوی پر احمد اپنا سکہ جما رہے تھے۔ ادھر احمد کی بیوی صفیہ، سبط حسن سے رومان لڑا رہی تھی۔ اور اِن کے جاننے پہچاننے والوں میں بھی اسی قسم کا سلسلہ جاری تھا۔

میں نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو بخدا چکرا گیا۔ کہ یہ ہو کیا رہا ہے میاں یہاں بیٹھے ہیں، اور اُن کی بیوی کسی غیر مرد سے چوما چاٹی کر رہی ہے۔ ایک شوہر اپنی سہرے جلوے کی بیاہی بیوی کو چھوڑ کر کسی ایکٹرس کے پیچھے مارا مارا پھر رہا ہے۔

میرا خیال ہے دنیا میں ایسے واقعات کی کمی نہیں۔ عورتیں اور مرد

ہمیشہ ایسے ہی سلسلے کرتے آئے ہیں ---!

ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مرد اپنی بیوی سے بے اعتنائی برتے اور کسی اور عورت کے عشق میں گرفتار ہو جائے تو اس کا نتیجہ بڑا ہر ہے۔ ہزاروں میں صرف چند عورتیں ایسی نکلیں گی جو کسی اور مرد سے ناتا نہ جوڑیں۔ پونا میں احمد اور نینا (شاہدہ) اکٹھے رہتے تھے۔ ایک بنگلہ تھا۔ بہت اچھا۔ لیکن احمد اس میں کبھی کبھار آتا۔ بیگم صاحبہ کی مزاج پرسی کرتا اور چلا جاتا۔ آہستہ آہستہ اس نے وہاں مستقل طور پر قیام کر لیا۔ اب وہ دونوں ایک ساتھ صبح کو ناشتہ کرتے، دوپہر کو لنچ کھاتے اور رات کو ڈنر پر بھی ایک ساتھ ہوتے۔

اسٹوڈیوں میں تو خیر اُن کا ایک ایک لمحہ ایک دوسرے کے ساتھ گزرتا۔ عجیب بات ہے۔ کہ اس دوران میں احمد نے کوئی ایسی حرکت نہ کی جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ شاہدہ کو اپنے قبضے میں لانا چاہتا ہے۔

شاہدہ کے خاوند محسن عبداللہ کو تو احمد اپنی حکمتِ عمل کے ذریعے سے اپنے اسٹوڈیو سے یوں نکال چکا تھا۔ جیسے مکھن سے بال۔ وہ بمبئی میں سڑکوں پر پیدل چلتا تھا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ وہ اپنی بیوی کی وجہ سے پونہ سے بمبئی کار میں آیا تھا۔ پر اب اُسے کوئی لفٹ

رہنے والا نہیں تھا۔

میں ایک روز ٹیکسی پر پیمنگٹن روڈ سے گزر رہا تھا کہ محسن مجھے نظر آیا۔ میں نے ٹیکسی رکوائی اور اس کی خیر خیریت پوچھی۔

"سنائیے محسن صاحب۔ آپ کہاں ہوتے ہیں آج کل ؟"

اس کے چوڑے چکلے چہرے پر مسکراہٹ ——— عجیب قسم کی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "آجکل میرا کام سڑکیں ناپنا ہے۔"

میں نے ازراہِ مذاق اس سے پوچھا "پیمنگٹن روڈ کی لمبائی اور چوڑائی کتنی ہے ؟"

اس نے بھی میرے ہی انداز میں جواب دیا "آپ جتنی لمبی ——— مجھ ایسی چوڑی۔"

میں نے اس سے کہا "کہ آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ۔ جہاں تمہیں جانا ہے وہیں چھوڑ دوں گا۔ مگر اس نے میری یہ دعوت قبول نہ کی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بہت مضطرب تھا۔

اور اس اضطراب کی وجوہ کئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنی بیوی کو قریب قریب کھو چکا تھا۔ سینہہ پر بھابہ رحمان اس سے سخت بے اعتنائی برت رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ جوئے میں اپنی ساری جمع پونجی ہار چکا تھا اور کوئی ملازمت بھی نہیں تھی۔ جس کا آسرا ہوتا۔

میں نے اُس سے پُوچھا "سناؤ یار، مس پردھان کا کیا حال ہے؟"

اس نے زہر خند کے ساتھ جواب دیا "ٹھیک ٹھاک ہے۔ اب اُس سے خواجہ احمد عباس عشق لڑا رہا ہے۔"

محسن نے مسکرا کر کہا "دو تین مہینوں کے اندر اندر گنجا ہو جائے گا"

میں نے پُوچھا "کیوں؟"

اُس نے جواب دیا "آپ اُس عورت کو نہیں جانتے، وہ عورت نہیں سیفٹی ریزر ہے۔ اور وہ بھی ایسا کہ اُس کے مونڈے ہوئے بال پھر کبھی نہیں اُگتے۔ میرے جسم پر بے شمار بال ہیں۔ میں نے سوچا اگر یہ سیفٹی ریزر میرے ہاتھ آ جائے تو میں کتنی جلدی اس لعنت سے نجات پا جاؤں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میں نے کوشش نہ کی۔ ورنہ میرا بھی حشر وہی ہوتا جو محسن عبداللہ اور خواجہ احمد عباس کا ہُوا۔ خواجہ گنجا ہو گیا اور محسن کے بال بھی جھڑنے لگے۔"

مدت کے بعد جب میں فلمستان میں بحیثیت افسانہ نگار و منظر نویس ملازم ہُوا۔ تو محسن سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کی حالت بہت دردناک تھی۔ مجھے معلوم تھا۔ کہ مسٹر ایس مکرجی کا دوست ہے۔ اس لئے کہ وہ دونوں بمبے ٹاکیز میں ایک ساتھ کام کر چکے تھے۔ اور وہاں کا اداکار بہت دوستانہ تھا۔

احمد بمبے ٹاکیز سے کبھی وابستہ نہیں رہا۔ وہ صرف سادھنا بوس کے ساتھ ایک دو برس رہا۔ معلوم نہیں، اُس کے ساتھ اُس کے کیا تعلقات

تھے۔ بہرحال وہاں سے نکل کر اُس نے اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کی اور اُس کا کرتا دھرتا بن گیا۔

میں اِس سے پیشتر اس مضمون کی پہلی قسط میں کہہ چکا ہوں کہ احمد بہت سیانا اور ذہین آدمی ہے۔ اُس نے بڑے بڑے مارواڑیوں کو غچّہ دیا۔ کچھ ایسے طور پر کہ اُن کو خبر تک نہ ہوئی۔

رفیق غزنوی

معلوم نہیں کیوں، لیکن میں جب بھی رفیق غزنوی کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے سلطان محمود غزنوی کا خیال آتا ہے جس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے تھے، جن میں سے بارہ مشہور ہیں۔ رفیق غزنوی اور محمود غزنوی میں اتنی مماثلت ضرور ہے کہ دونوں بت شکن ہیں۔ رفیق غزنوی کے پیشِ نظر کوئی ایسا سومنات نہیں تھا جس کے بت توڑ کر وہ اُس کے پیٹ سے زر و جواہر نکالتا، پھر بھی اُس نے اپنی زندگی میں کئی طوائفوں کو (جن کی تعداد بارہ تک پہنچ سکتی ہے) استعمال کیا۔

رفیق غزنوی کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے آبا و اجداد غزنی کے رہنے والے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اُس نے غزنی دیکھا ہے یا نہیں۔

صرف اِتنا معلوم ہے کہ وہ پشاور میں رہتا تھا۔ اُس کو پشتو بولنا آتی ہے افغانی فارسی بھی جانتا ہے۔ ویسے عام طور پر پنجابی میں گفتگو کرتا ہے۔ انگریزی اچھی خاصی لکھ لیتا ہے۔ اردو میں اگر مضمون نگاری کرتا تو اس کا بڑا نام ہوتا۔

اُس کو اُردو ادب سے بڑا شغف ہے۔ اُس کے پاس اُردو لٹریچر کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ گلشن محل (دبیبے) میں اُس کے کمرے میں بڑی ترتیب سے رکھی ہوئی کتابیں دیکھیں تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ شخص ایک مہراثی ہے، جسے ادب سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب اُس سے باتیں ہوئیں تو اُس نے ایسے ایسے مصنفوں کا نام لیا جن سے میں واقف نہیں تھا۔ اُس نے میری معلومات میں یہ اضافہ کیا کہ ایک ابوالفضل صدیقی ہیں جو چرندوں اور پرندوں کی کہانیاں لکھنے کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ چنانچہ میں نے اُن کے افسانے پڑھے اور پسند کئے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مضمون جو مجھے رفیق غزنوی پر لکھنا ہے کہاں سے شروع کروں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ شروع ہو چکا ہے اور اس کا خاتمہ بالخیر بھی ہو جائے گا۔ اس ضمن میں اپنے حافظے کو ٹٹول کر آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اُس سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی۔

عجیب بات ہے کہ اُس سے جسمانی طور پر متعارف ہونے سے پہلے ہی میں اُسے جانتا تھا۔ کیسے جانتا تھا کب جانتا تھا یہ مجھے یاد نہیں۔ آج سے غالباً چوبیس پچیس برس پیچھے کی بات ہے میں امرتسر میں بجلی والے چوک سے گذر رہا تھا کہ ایک پان والے نے مجھے آواز دی۔ میں رُک کر اُس کی دکان کے پاس گیا تو اُس نے مجھ سے کہا "بابو صاحب۔ اتنی دیر ہو گئی ہے اب تو حساب چُکا دیجئے۔"

میں بہت متحیر ہوا، اِس لئے کہ اُس پان والے سے میرا کوئی حساب کتاب نہیں تھا۔ میں نے اُس سے کہا "کیسا حساب ۔۔۔ میں تو آج پہلی مرتبہ تمھاری دکان کے پاس ٹھہرا ہوں۔"

یہ سن کر پان والے کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "رنبینے والے اسی طرح کہا کرتے ہیں۔"

جب میں نے اُس سے تفصیل چاہی تو پتہ چلا کہ وہ مجھے رفیق غزنوی سمجھا تھا جو اُس سے اُدھار لیتا رہا تھا۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں سعادت حسن ہوں تو اُس نے مجھ سے کہا کہ میری اور رفیق کی شکل بہت ملتی جلتی ہے۔

رفیق غزنوی کا نام تو میں بہت پہلے سن چکا تھا۔ اس سے ملنے کی مجھے کوئی خواہش نہیں تھی، پر جب میں نے سُنا کہ اُس کی شکل میری

شکل کے مشابہ ہے تو مجھے اُس کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہُوا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے آوارہ گردی شروع کر رکھی تھی طبیعت ہر وقت اچاٹ اچاٹ سی رہتی تھی۔ ایک عجیب قسم کی کُمدبَر ہر وقت دل و دماغ میں ہوتی رہتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ جو چیز بھی سامنے آئے اُسے چکھوں، خواہ وہ انتہا درجے کی کڑوی ہی کیوں نہ ہو۔

تکیوں میں جاتا تھا۔ قبرستانوں میں گھومتا تھا۔ جلیاں والا باغ میں گھنٹوں کسی سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر کسی ایسے انقلاب کے خواب دیکھتا تھا جو چشمِ زدن میں انگریزوں کی حکومت کا تختہ اُلٹ دے۔ اسکولوں کو جاتی ہوئی لڑکیوں کے جھرمٹ دیکھتا تھا اور اُن میں کوئی اچھی سی لڑکی منتخب کر کے اُس سے عشق لڑانے کے منصوبے تیار کرتا تھا۔ بم بنانے کے نسخے حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ بڑے بڑے گویوں کے گانے سنتا تھا اور کلاسیکل موسیقی کو سمجھنے کے لئے پیچ و تاب کھاتا تھا۔

میں نے اِس زمانے میں شعر کہنے کی بھی کوشش کی۔ فرضی معشوقوں کے نام عطر لگے کاغذوں پر بڑے بڑے طویل محبّت نامے بھی لکھے مگر بکواس سمجھ کر پھاڑ دیئے۔ دوستوں کے ساتھ مل کر پیرس کے سگرٹ پیئے۔ کوکین کھائی۔ شراب پی، مگر جی کی بے کلی دور نہ ہوئی۔

شدید آوارگی کے اِسی دَور میں مجھے رفیق غزنوی سے ملنے کی

خواہش ہوئی۔ چنانچہ میں تکیوں میں، شراب خانوں میں اور رنڈیوں کے کوٹھوں پر جا جا کر پوچھا کہ رفیق غزنوی کہاں ہے مگر کسی نے اُس کا ٹھور ٹھکانا نہ بتایا۔ کئی بار سُننے میں آیا کہ وہ امرتسر میں آیا ہوا ہے۔ میں نے ہر بار بڑی مستعدی سے اُس کو ڈھونڈا مگر اُس کا نشان نہ ملا۔

ایک دن پتہ چلا کہ وہ اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ اُس کا یہ دوست ایک درزی تھا جس کا نام بھی ل گیا ہوں۔ اِس کی بیٹھک ہمارے گھر کے پاس کرموں ڈیوڑھی کی ایک گلی میں تھی جہاں وہ کام کرتا تھا۔ میں نے رفیق کو یہاں تلاش کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ شہر کے باہر ایک غیر آباد سے علاقے میں مقیم ہے جہاں اُس درزی کا گھر تھا۔ یہ پتہ مجھے بالے نے دیا۔ وہ بھی وہیں جا رہا تھا۔ موقع بڑا اچھا تھا چنانچہ میں اُس کے ساتھ ہو لیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں بالے کا تعارف کرا دوں۔ مجھے یہ بتلاتے ہوئے دُکھ ہوتا ہے کہ لوگ اُسے بالا کنجر کہتے تھے۔ معلوم نہیں انسانوں کے ساتھ اُن کے آباؤ اجداد کی ذات کیوں منسوب کر دی جاتی ہے۔ بالا جیسا کہ میں جانتا ہوں نہایت خوش ذوق نوجوان تھا۔ تعلیم یافتہ۔ خوبصورت۔ ہلسوڑ۔ بذلہ سنج شاعر مزاج اُس کی طبیعت میں وہ جوہر تھا جو کسی بھی انسان کو فن کی پابندیوں پر

پہنچا سکتا ہے۔

اُس کو معلوم تھا کہ لوگ اُسے کس نام سے یاد کرتے ہیں لیکن اُس کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ رہتا سہتا وہیں تھا جہاں عورتیں اپنا جسم بیچتی ہیں۔ اب وہ کراچی میں رہتا ہے اور اپنا فن بیچتا ہے۔ پچھلے دنوں مجھے ایک اخبار کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ وہ ایک مشہور مصوّر ہے جس کی تصویروں کی نمائش اہلِ نظر حضرات میں بہت مقبول ہوئی۔

بالا گاتا بھی تھا، مگر اُس کی آواز بھدّی تھی۔ کیپٹن وحید، انور پینٹر، عاشق علی ڈڈگرافر، شاعر فقیر حسین سلیس۔ گیانی ارور سنگھ دندان ساز۔ ان سب کی ایک بوہیمیانہ قسم کی ٹولی تھی۔ ان کا بیٹھنا اُٹھنا زیادہ تر انور پینٹر کی، یا گیانی اروڑ سنگھ کی دکان میں ہوتا تھا۔ یا ان کی نشست بیچے (عزیز) کے ہوٹل شیراز اور اُس درزی کی بیٹھک میں ہوتی تھی جس کا نام میں بھول گیا ہوں۔

بھنگ گھوٹی یا گوشت میں بھونی جاتی تھی اور طبلے کی تھاپ پر راگ راگنیاں، ٹھمریاں، دادرے الاپے جاتے تھے۔ عاشق علی ڈڈگرافر کی آواز سُریلی لیکن بہت پتلی تھی۔ وہ اکثر زنجوٹی کی بحر دل میں گاتا تھا۔ کیپٹن وحید طبلہ بجاتا تھا۔ انور پینٹر صرف داد دیتا تھا۔

گیانی اروڑ سنگھ دانت اکھیڑ نا مقبول کر خان صاحب عاشق علی خان (نان کپتان خان فتح علی خان کے فرزند) کی گمبھیر اور بالشت بھر چوڑی آواز میں اکثر پہاڑی سُنایا کرتا تھا اور ریالا صرف لطیفے۔ کبھی کبھی اپنی تازہ غزل بھی۔ مجھے اُس کی ایک غزل کا صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے ۔ ؎

اشک مژگاں پہ ہے اٹک سا گیا
نوک سی چبھ گئی ہے چھالے ہیں

ہالے ہیں، شولے ہیں، اجالے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اچھی غزل تھی۔

گیانی اروڑ سنگھ کا اچھا بھلا کام چل رہا تھا۔ مگر جسے آرٹ کی چاٹ پڑ جائے، اُس کا اللہ ہی حافظ ہے۔ راگ کی دنیا میں وہ ایسا کھویا کہ دندان سازی کی دکان معہ جملہ ساز و سامان کے غائب ہو گئی اور رینیٹر کا بھی دیوالہ پٹ گیا۔

عاشق علی فوٹوگرافر کا بھی یہی حال ہوا ہے۔ چنانچہ وہ ایک دن امرتسر سے ایسا غائب ہوا کہ ابھی تک لاپتہ ہے۔ جیسے (عزیز) کا نام نشان تک باقی نہ رہا۔ اب وہ لاہور میں مطلب کرتا ہے۔ شاعر فقیر حسین سلیس صابن بنا رہا ہے۔

گیانی اروڑ سنگھ کامیاب ایکٹر بنا، مگر اب سُنا ہے کہ اُس نے دنیا

تیاگ دی ہے اور خدا سے لَو لگائے بیٹھا ہے۔ کیپٹن وحید نے پانچ بچوں والی ایک عورت سے شادی کر لی۔ آجکل ٹھیکیداری کرتا ہے

رفیق غزنوی جس رنگ میں پہلے تھا، اُسی میں ہے۔ کراچی میں ریس کے گھوڑے دوڑاتا ہے اور فلموں میں موسیقی بھرتا ہے۔

بڑی مصیبت ہے، میں نے جب بھی ایسے موضوعات پر قلم اُٹھایا جو پرانی یادوں کے متعلق ہوں تو ہمیشہ بھٹک گیا۔ اب دیکھیے میں بات رفیق غزنوی سے ملنے کی کوشش کی کر رہا تھا اور چلا گیا فروعات میں ـــــ لیکن سچ پوچھیے تو مجھے فروعات ہی سے محبت ہے میں زندگی کو بھی ایک فروعی چیز سمجھتا ہوں۔

ہاں جناب، تو میں بابے کے ساتھ ہو لیا۔ اپریل کی خنک رات تھی۔ تانگہ دیر تک چلتا رہا۔ آخر بابے نے ایک نیم تاریک مقام پر اُسے ٹھہرایا۔ آج سے تینتیس چونتیس برس پہلے کی بات ہے، لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس یک منزلہ مکان میں ہم داخل ہوئے وہ پیڑوں اور جھاڑیوں سے گِھرا ہوا تھا۔ اندر لالٹین جل رہی تھی۔ میدھا موٹا اور وہ درزی جس کا نام میں بھول گیا ہوں، اپنے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے فلش کھیلنے اور شراب پینے میں مشغول تھے۔

مجھے میدھے موٹے سے سخت نفرت تھی۔ اول تو یہ کہ وہ بہت

موٹا اور بہت طاقتور تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ زبردستی مجھے فلش کھیلنے کو
کہتا اور پتے بازی کر کے مجھ پر آٹھ دس روپے کا قرض چڑھا دیتا اور
دوسرے تیسرے دن مجھے کسی بازار یا گلی میں پکڑتا اور اپنا خوفناک
چاقو دکھا کر اسے وصول کر لیتا۔

بلّے نے درزی سے رفیق کے بارے میں پوچھا تو جواب ملا
کہ وہ دو روز سے غائب ہے۔ کہاں ہے یا ہو سکتا ہے اس کے
متعلق اسے علم نہیں تھا۔ درزی نے کہا "بلّے، تمہیں معلوم ہی ہے۔
جب وہ کسی کے سر پر چڑھتا ہے، پندرہ دن کے بعد ہی نیچے آترتا
ہے۔"

بالا مسکرا دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اُس کو اچھی طرح معلوم ہے۔
میری یہ کوشش بھی بیکار گئی۔ غالباً ایک برس کے بعد میں نے
اُس کا فوٹو عاشق علی کے ڈارک روم کی ایک ڈش میں پانی پر تیرتا ہوا
دیکھا۔ عاشق علی بہت اچھا فوٹوگرافر تھا۔ غالباً وہ پہلا شخص تھا جس نے
فوٹوگرافی کے قدیم اصولوں کی خلاف ورزی کی۔

عام طور پر فوٹوگرافر یہ کرتے تھے کہ اپنے گاہک کو خوش کرنے
کے لئے اُس کے چہرے کی وہ تمام لکیریں دور کر دیتے تھے جو انسان میں
اُس کے کردار اور تشخص کی مظہر ہوتی ہیں۔ وہ اُس کے چہرے کو چھپا ہوا

آلو سا بنا دیتے لئے جس پر کوئی داغ دھبہ ہو نہ کوئی سموٹ لکیر۔
عاشق علی کہتا تھا، فوٹو گرافر کا کام یہ ہے کہ انسان کو اُس طرح پیش کرے
جس طرح کہ وہ اُسے دیکھتا ہے۔ کیمرے کا کام صرف عکس لینا ہے
اور بس۔

عاشق علی روشنی اور سایوں کے امتزاج کا خاص خیال رکھتا ہے۔
رفیق کی جو تصویر میں نے دیکھی، میرا خیال ہے وہ عاشق علی کا شاہکار
تھی۔ رفیق نے عربوں کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اُس کا ملبوترہ چہرہ بہت
پُرکشش تھا۔ سائے زیادہ تھے اور روشنیاں کم۔ خدوخال تیکھے اور
نوکیلے نہیں تھے مگر جاذبِ نظر تھے۔ بڑی وجیہہ شکل و صورت تھی ناک
لمبی جو پھننگ کے قریب چوڑی ہو گئی تھی۔ ہونٹ ایک دوسرے میں
پیوست۔ ان کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی نکونیں۔ بال پیچھے کی طرف
کنگھی کئے ہوئے۔ لمبی قلمیں ـــــ مجھے اُس میں اور اپنے میں کوئی مماثلت
نظر نہ آئی۔ معلوم نہیں اُس پان والے کو مجھ پر اُس کا دھوکا کیسے ہو گیا۔

عاشق علی نے مجھے بتایا کہ رفیق پرسوں آیا تھا اور اُسی روز
شام کو واپس لاہور چلا گیا۔ میں لاہور پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ راولپنڈی
میں ہے ـــــ اب راولپنڈی کون جاتا میں واپس امرتسر چلا آیا۔
آٹھویں روز پتہ چلا کہ وہ امرتسر ہی میں ایک طوائف کے مکان پر نظر بند

تھا — میں جھنجھلا گیا۔

کئی برس گزر گئے، مگر رفیق غزنوی سے ملاقات کی کوئی سبیل پیدا نہ ہوئی۔ میں یوں بھی تھک ہار کر اُس کو تلاش کرنے کی سرگرمی ترک کر چکا تھا۔ اِس دوران میں البتہ یہ معلوم ہوتا رہا کہ وہ کٹڑہ گھنیاں کی قریب قریب تمام مشہور طوائفوں کو سرفراز کر چکا ہے۔

رفیق کی اپنے مخصوص طرز میں گائی ہوئی غزلیں ہر کوٹھے پہ گائی جانی لگیں۔

یہ کیا ہے جی؟ — رفیق کی بحر ہے۔ یہ کیا انداز ہے سرکار؟ — حضور، رفیق غزنوی کا۔ یہ چکنا چور گھڑی رفیق صاحب کی ہے۔ کل انھوں نے تان بدلی تو زور سے ہاتھ لہرایا۔ کلائی دیوار کے ساتھ ٹکرائی اور گھڑی کے ہزار ٹکڑے۔ پرسوں رفیق غزنوی ایک رنڈی کے کوٹھے پر گانا سنانے لگا۔ سازندے بہک گئے۔ رفیق نے طبلے والے سے کہا تم بھی کر دو سُر میں اپنے طبلے۔ طبلچی نے کہا، میں کر چکا ہوں۔ رفیق نے کہا، دوبارہ کر دو — دائیں پر ابھی ابھی ایک مکھی بیٹھ گئی تھی — لعنت ہے اُس مکھی پہ اور لعنت ہے رفیق غزنوی پہ۔

اُن دنوں یہ غزل عام طور پہ رفیق کی بحر میں گائی جاتی تھی۔ دیکھئے حافظے پہ زور دے کر اُس کا کوئی شعر یاد کرتا ہوں — نہیں یاد آ رہا۔ کچھ ایسا ہی تھا —

سو رہے ہیں پاسباں یا ہے خوابِ ناز میں

اور خدا معلوم کیا۔

نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

شاید اقبال کی کوئی غزل تھی۔ معاف کیجئے گا میرا حافظہ بہت کمزور ہے۔

اِس کے بعد معلوم ہوا کہ اے۔ آر۔ کاردار لاہور میں پنجاب کا پہلا متکلم فلم "ہیر رانجھا" بنا رہا ہے اور رفیق اِس کا ہیرو ہے، یعنی رانجھا۔ ہیروئن امرتسر کی ایک طوائف انوری ہے (یہ آجکل ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل جناب احمد سلمان سابق جگل کشور مہرہ کی بیگم ہیں) کیدو کا پارٹ ایم اسمٰعیل کو دیا گیا ہے۔

فلم بن گیا مگر میں لاہور نہ جا سکا۔ معلوم نہیں کیوں ـــ اس دوران میں مختلف افواہیں سننے میں آتی رہیں۔ کاردار کا رفیق سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ رفیق، انوری سے رومان لڑا رہا ہے۔ انوری کی ماں سخت برہم ہے۔ ضرور ایک روز چاقو چھری چلیں گے ـــ لیکن ایک دن یہ خبر آئی کہ رفیق انوری کو بڑے ڈرامائی انداز میں لے اُڑا ہے۔

یہ خبر سچی تھی۔ واقعی وہ انوری کو لے اُڑا تھا۔ انوری کی ماں بہت چیخی چلائی تھی۔ رفیق کے پیچھے غنڈے بھی لگائے گئے تھے، مگر اس نے

کوئی پروا نہ کی اور شربتِ وصال کسی کے ساتھ ملا ملا کر پیتا رہا۔ آخر اُس نے انوری کو اُس کی ماں کے پاس امرتسر روانہ کر دیا۔ اِن فاتحانہ مگر نہایت "تکلیف دہ الفاظ کے ساتھ "لو سنبھال ذرا اپنی "سُنڈ کی پڑی" کو"

وہ بے چاری اب اپنی "سُنڈ کی پڑی" کو کیا سنبھال کے رکھتی جس دن کے لیئے اُس نے اُسے سنبھال سنبھال کے رکھا ہوا تھا، اُس پر تو رفیق غاصبانہ قبضہ کر چکا تھا۔ کر چکا تھا کیا، کر کے فارغ ہو چکا تھا۔ چنانچہ اُس نے مصلحت اِسی میں سمجھی کہ یہ "پڑی" دوسرے لفظوں میں اپنی 'گُڑی' غیر مشروط طور پر رفیق غزنوی کے حوالے کر دے۔

رفیق غزنوی کا حسن و عشق کے سومنات پر یہ پہلا معرکہ آرا حملہ ہے۔

انوری کے بطن اور رفیق کے نطفے سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام زرینہ رکھا گیا۔ (جو نسرین کے فلمی نام سے اے آر کاردار ہی کے فلم "شاہ جہاں" میں روحی کے روپ میں جلوہ گر ہوئی حال ہی میں ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل جناب احمد سلمان سابق جگل کشور مہرہ کی دختر نیک اختر کی حیثیت سے اُس کا نکاح کراچی میں ایک صاحب ثروت سے ہوا ہے۔)

کئی اور برس گذر گئے —— اِس دوران میں کن کن مراحل سے مجھے گذرنا پڑا، اِس کا ذکر مناسب معلوم نہیں ہوتا اس لیئے کہ اس مضمون کا موضوع

صرف رفیق غزنوی کی ذات ہے۔

میں بمبئے پہنچ گیا۔ وہاں بہت دیر تک اخباروں میں جھک مارتا رہا۔ اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ رفیق نے انڈری کو چھوڑ دیا ہے اور اب کلکتے میں ہے جہاں وہ فلموں کے لئے موسیقی مرتب کرتا ہے۔

میں لکھنا شروع کر چکا تھا۔ ادبی حلقوں سے میرا تعارف بھی ہو گیا تھا اس لئے اُردو ادب سے دلچسپی لینے والے مجھے جاننے لگے تھے۔ دیر تک اخباروں میں جھک مارنے کے بعد میں فلمی دُنیا میں داخل ہوا۔ یہاں بھی ایک دو برس جھک مارنا پڑی۔ اپنے لئے کوئی مقام پیدا کرتے کرتے میں ہندوستان سنے ٹون پہنچ گیا جس کے مالک سیٹھ نانو بھائی ڈیسائی تھے۔ آپ نے کئی فلم کمپنیاں قائم کیں، اُن کا دیوالہ نکالا۔ اب انھوں نے ہندوستان سنے ٹون کے نام سے ایک نئی فلم کمپنی قائم کی تھی جس کے قیام کے ساتھ ہی دیوالیے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

میں نے اس کمپنی کے لئے "مڈ" یعنی کیچڑ کے عنوان سے ایک کہانی لکھی جو بہت پسند کی گئی۔ یہ اشتراکی خیالوں پر استوار کی گئی تھی۔ مجھے حیرت ہے، اس زمانے میں سیٹھ نانو بھائی ڈیسائی نے اِسے کیوں پسند کیا۔

میں مکالمے لکھنے میں مصروف تھا کہ مجھ سے کسی نے کہا کہ رفیق غزنوی

اسٹوڈیو میں موجود ہے اور تم سے ملنا چاہتا ہے۔ پہلا سوال جو میرے دماغ میں پیدا ہوا یہ تھا کہ وہ مجھے کیسے جانتا ہے۔ میں کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک لم تڑنگ آدمی بہت عمدہ سلے ہوئے سوٹ میں نمودار ہوا —— یہ رفیق غزنوی تھا۔

اُس نے کمرے میں اندر داخل ہوتے ہی مجھے موٹی گالی دی اور کہا، "تم یہاں چھپے بیٹھے ہو!"

اِسی لمحے —— اسی ثانیے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں رفیق غزنوی کو ازل سے جانتا ہوں۔ چنانچہ ہم دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں بڑے بے تکلف انداز میں کرتے رہے۔

اُس کے لب و لہجے، اُس کی حرکات و سکنات میں ایک عجب سطحی قسم کا لا اُبالیانہ پن تھا —— جو تصویر میں نے عاشق علی فوٹو گرافر کے ڈارک روم میں ڈش کے اندر پانی میں ڈبکیاں لگاتی دیکھی تھی۔ اُس میں اور گوشت پوست کے رفیق غزنوی میں یہ فرق تھا کہ وہ گنگ تھی اور یہ متکلم۔ لیکن اُس کے تکلم کا انداز اُس پہ سجتا نہیں تھا۔ اگر اُس کے ہونٹ نہ کھلتے، اگر کھلتے تو بے ہنگم طریق پر نہ کھلتے جو اُس کے بھدّے دانتوں اور مسوڑوں کی بے وجہ نمائش کرتے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اگر اُس کی گفتگو میں بازاریت کا رنگ نہ ہوتا تو میں شاید اُس کے

بھدے دانتوں اور مسوڑوں کو بھی برداشت کر لیتا مگر معاملہ اس کے برعکس تھا۔

اُس کے ہاتھ نچانے کا انداز بھی مجھے پسند نہ آیا۔ مجھے یہ محسوس ہوتا کہ وہ جس سے مخاطب ہے، ابڑے اونچے طبقے سے تعلق دکھتا ہے۔ یہ احساس ظاہر ہے کہ میرے لئے خوشگوار نہیں تھا۔ بہر حال چونکہ پہلی ملاقات تھی اور وہ بھی اتنے اشتیاق کے بعد۔ میں نے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا گہرا اثر نہ لیا۔

جب رفیق جانے لگا تو اُس نے مجھے بتایا کہ وہ بمبے سنٹرل اسٹیشن کے سامنے ایک ہوٹل میں (جس کا نام میں بھول گیا ہوں) ٹھہرا ہے۔ وہ بڑی بے سرو سامانی کی حالت میں کلکتے سے آیا تھا۔ اُس کو اُمید تھی کہ بمبئی میں اُسے کام مل جائے گا۔

چونکہ اُس نے مجھے مدعو کیا تھا، اس لئے میں شام کو اُس کے ہوٹل میں پہنچا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد اُس کا کمرہ مل گیا —— اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے مجھے ایک کونے میں قالین کے ایک ٹکڑے پر دو چھتری نما نظر آئی جو ریشمی کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے دوسرے کونے میں رفیق کے شو اور جوتے تھے جو بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ پھر مجھے ایک عورت نظر آئی جس کے طوائف ہونے میں

کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا، یہ زہرہ تھی (جو اب زہرہ مرزا ہے۔ مرزا صاحب کسی زمانے میں فلم ڈائرکٹر تھے۔ اب پندرہ سولہ برس سے وہ فلم کمپنی کھولنے کی کوشش میں مصروف ہیں)

زہرہ کے ساتھ دو بچے تھے۔ ایک لڑکا، ایک لڑکی۔ لڑکا چھوٹا تھا۔ لڑکی بڑی جس کا نام پروین تھا (یہ فلمی دنیا میں شاہینہ کے نام سے داخل ہوئی۔ پہلا فلم "بیلی" تھا جس کی کہانی میری تھی۔ یہ بہت بُری طرح ناکام ہوا) اُس کی عمر اُس وقت پانچ برس کی ہوگی۔

دیکھئے، میں لکھتے لکھتے واقعات کی رَو میں ایسا بہا کہ آپ کو یہ بات بتانا بھول ہی گیا کہ جب میں فلمی دنیا میں داخل ہوا۔ یعنی جب میں نے امپیریل فلم کمپنی میں بطور "منشی" ملازمت کی تو اُس زمانے میں دو نوجوان لڑکیاں لائی گئیں۔ ایک دبلی تھی، دوسری موٹی۔ (یہ زہرہ کی چھوٹی بہنیں تھیں، شیداں اور ہیراں)

شیداں بلا کی چنچل تھی۔ بوٹی بوٹی پڑی ناچتی تھی۔ ناک نقشہ اچھا۔ لیکن بہت تیز بولتی تھی۔ اتنی تیز کہ ایک لفظ دوسرے لفظ پر سوار ہو جاتا۔ مجھے اُس سے گفتگو کرتے وقت بہت اُلجھن ہوتی تھی۔ اسی سے مجھے معلوم ہوا کہ پیکو بھائی جان (رفیق غزنوی) انوری کو چھوڑ چکا ہے اور اُس نے اُس کی بڑی بہن زہرہ سے بیاہ کر لیا۔

ہیراں موٹی اور پھسپھس تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فلموں میں نہ چل سکی۔ شیداں کو امپیریل کی رنگین فلم "ہند ماتا" میں کام مل گیا جو کامیاب رہا۔

میں آپ کو ایک دلچسپ لطیفہ سناتا ہوں۔ ایک روز میں کسی کام سے امپیریل فلم کمپنی کے مالک سیٹھ آرڈیشر ایرانی سے ملنے گیا۔ دفتر کا 'سونگ ڈور' کھولتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ سیٹھ بڑے اطمینان سے شیداں کا ایک پستان یوں دبا رہے ہیں جیسے کسی موٹر کار کا ہارن ـــ میں اُلٹے پاؤں واپس چلا آیا۔

اب میں پھر زہرہ کی لڑکی پری زین کی طرف آتا ہوں۔ اُس کی آنکھیں نیلی تھیں جس طرح زرینہ المعروف نسرین کی ہیں۔ رفیق کی آنکھیں نیلی نہیں۔ انوری اور زہرہ کی بھی نہیں اور یہ دونوں بالترتیب زرینہ اور شاہینہ کی مائیں ہیں۔ اصل میں آنکھوں کا یہ نیلا پن ان لڑکیوں کو ان کی دادی سے ملا ہے۔ اُس کی آنکھیں یہ بڑی بڑی اور نیلگوں تھیں۔ قد کاٹھ کی بہت تگڑی تھی مگر چنیا بیگم کی رسیا۔

خیر ـــ رفیق مجھ سے ملا۔ میں کمرے کا جائزہ لیتے ہی بھانپ گیا تھا کہ وہ انتہائی کس مپرسی کے عالم میں یہاں آیا ہے اور تلاشِ روزگار میں سرگرداں۔

میں یہاں آپ کو رفیق کی عجیب و غریب شخصیت کا ایک عجیب و
غریب پہلو دکھانا چاہتا ہوں۔ جب اُس پہ بمبئی کی زبان میں کڑکی یعنی
مفلسی کا زمانہ آتا ہے تو وہ بہترین لباس پہنتا ہے۔ جب یہ دَور گذر جاتا
ہے تو وہ معمولی کپڑے پہننے لگتا ہے —— یوں وہ ہر لباس میں بانکا
سجیلا نظر آتا ہے۔ اُس کو ہر لباس پہننے کا سلیقہ ہے۔

ہوٹل کے کمرے میں ہم تھوڑی دیر رہے۔ اس کے بعد نیچے باغیچے
میں چلے گئے۔ میں وسکی کی بوتل اپنے ساتھ لایا تھا، چنانچہ ہم دیر تک
پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں ایک دلچسپ واقعہ
ظہور پذیر ہوا۔

ہم پی رہے تھے کہ ایک بھرے بھرے جسم اور اچھے خاصے ڈیل
ڈول کی عورت آئی۔ اس نے رفیق کی طرف اپنی چندھی آنکھوں سے دیکھا
اور مسکرا کر کرسی پہ بیٹھ گئی۔ رفیق نے اُس کو گلاس پیش کیا جو اُس نے
لے لیا۔ اس کے بعد رفیق نے میرا اُس سے تعارف
وہ کوئی فلم زدہ عورت تھی۔ ہم رہا رہے ہیں آپ کو ایک واقعہ
سامنا کرنا پڑا۔ ایک اسٹڈیو میں
لڑکپن کے جادو سے بہت آگے
کا زمانہ تھا سگرٹوں کے تمام اچھے برانڈ
سکھ مذہب سے تعلق رکھتی
میں نے اُس کے ہاتھ میں کے یو ن اے' کا
آئی ہے کہ اشوک کمار سگرٹ ہیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ڈبہ پکڑنا

اس سے کہلاتے، اسالی چھیڑ اشوک کمار کہ اپنا ڈیل ڈول دیکھ کے ہی چھاتی
پر اگر اشوک کمار کو بٹھا دوں تو ایسا معلوم ہوگا طوطا توپ چلا رہا ہے۔"
ضلع جگت پھبتی رفیق کا محبوب ترین مشغلہ ہے، بلکہ یوں کہیئے کہ
یہ اُس کی طبیعت بن چکا ہے۔ وہ سکھنی (جس کا نام میں بھول گیا ہوں)
یہ پھبتی سُن کر خاموش رہی۔ لیکن رفیق نے بڑے زور کا قہقہہ بلند کیا
اور دیر تک ہنستا رہا۔
یہ بھی اُس کی عادت ہے کہ پھبتی کہے گا، چُست ہو یا پھسپھسی۔
کوئی داد دے نہ دے، لیکن وہ خود اپنے کو خوب داد دے گا۔ اتنا ہنسے گا،
اتنا شور مچائے گا کہ مجبوراً آپ کو بھی اُس غل غپاڑے میں شریک ہونا پڑیگا۔
سکھنی معمولی شکل صورت کی تھی۔ موٹے موٹے نقش۔ بہت ہی تنگ
ما تھا۔ مرد نما۔ رفیق اُس سے باتیں کر رہا تھا، مگر مجھے احساس تھا کہ
اُسے اُس عورت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اُس کی باتیں محض برائے باتیں تھیں۔
کی داڑھی سے نہ کہہ رہا تھا کہ وہ اُس سے جسمانی رشتہ قائم کرنا چاہتا
قد کاٹھ کی بہت تگڑی تھی مگر اشوک کمار سوار تھا۔ رفیق نے جب زور
خیر ــــ رفیق مجھ سے ملا کہ انداز میں جھنجھلا کے بولی: سُن لے
گیا تھا کہ وہ انتہائی کس مپرسی کے عالم میں
میں سرگرداں۔
ہیں...... تم نہیں جانتی ہو۔

میں بہت بڑا کتا ہوں۔ بڑی اعلیٰ نسل کا۔"

نسل وسل کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا، لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ رفیق غزنوی واقعی بہت بڑا کتا ہے جس کی دُم صرف طوائفیں ہی ہلا سکتی ہیں کوئی شریف خاتون لاکھ پچکارے، چمکارے اُس کی دم میں خفیف سی بھی جنبش پیدا نہیں ہوگی۔

یہ میری اُس کی پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہے۔ میں یہاں اُس کے کردار کا ایک اور پہلو واضح کردوں کہ وہ اوّل درجے کا کمینہ، سفلہ اور خود غرض ہے۔ اپنی ذات اُس کیلئے سب سے مقدم ہے۔ وہ کھانا جانتا ہے، کھلانا نہیں جانتا۔ لیکن مطلب ہوگا تو وہ بڑی پُرتکلف دعوتیں بھی کرے گا، مگر ان دعوتوں میں بھی وہ مہمانوں کا کچھ خیال نہ کرتے ہوئے، سب سے پہلے مُرغ کے بہترین حصے اپنی پلیٹ میں ڈال لے گا۔

وہ دوستوں کو بہت کم سگرٹ پیش کرتا ہے۔ میں آپ کو ایک واقعہ سُناتا ہوں جب مجھے بڑی خفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک اسٹوڈیو میں اُس سے ملاقات ہوئی۔ جنگ کا زمانہ تھا سگرٹوں کے تمام اچھے برانڈ بلیک مارکٹ میں بکتے تھے۔ میں نے اُس کے ہاتھ میں "کریون اے" کا ڈبّہ دیکھا۔ یہ میرے مرغوب سگرٹ ہیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ڈبّہ پکڑتا

چاہا، مگر اُس نے اپنا ہاتھ جھٹک کر ایک طرف کر لیا۔ میں نے کہا "ایک سگرٹ دینا یار۔"

رفیق نے پیچھے ہٹ کر ڈبہ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ "نہیں منٹو ـــــ اوّلاً میں اپنا سگرٹ کسی کو دیا نہیں کرتا۔ ثانیاً یہ سگرٹ اعلیٰ درجے کے ہیں۔ تمہاری عادت بگڑ جائے گی۔ تم اپنے گولڈ فلیک پیا کرو۔"

میرے جاننے والے تین چار آدمی پاس کھڑے تھے۔ میں پانی پانی ہو گیا۔ سمجھ میں نہ آیا، کیا کہوں اور کیا کروں۔ ناچار کھسیانا ہو کر زہنی ٹانگ نوچنا شروع کر دی۔

رفیق پرلے درجے کا بے غیرت۔ کہنے کو تو پٹھان ہے لیکن غیور قطعاً نہیں۔ سنا ہے کہ پہلے اُس کا سلسلہ زہرہ کی ماں سے تھا۔ اِس کے بعد اُس کی بڑی لڑکی مشتری سے ہوا۔ پھر زہرہ کی باری آئی، آخر میں شیداں کی۔

مجھے معلوم نہیں شیداں سے اُس کا ٹانکا کیسے ملا۔ اتنا یاد ہے کہ وہ اُن دنوں ماہم میں رہتا تھا۔ اینکلیسٹو مینشن کی بالائی منزل پر اُس کا فلیٹ تھا۔ اس کے سامنے میری بہن رہتی تھی۔

میری شادی ہو چکی تھی اور میں اڈلفی چیمبرز کلیئر روڈ میں مقیم تھا۔ رفیق کا ہمارے یہاں آنا جانا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن پر بھی ہماری اکثر ملاقات

ہو جاتی تھی۔ ایک روز وہ اپنا پروگرام ختم کر کے اسٹوڈیو سے باہر نکلا تو بڑی افراتفری میں تھا۔ دیر کے بعد ملا تھا، اس لئے میں نے پوچھا "سناؤ رفیق کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

اُس نے جواب دیا "عشق ہو رہے ہیں —— ڈبلے ہو رہے ہیں"۔

واقعی عُشق ہو رہے تھے۔ کیونکہ ایک دن معلوم ہوا کہ زہرہ کی چھوٹی بہن خورشید (شیداں) نے افیم کھالی ہے۔ (زہرہ بھی چلیا بیگم کی عاشق ہے) دونوں بہنوں میں زبردست چخ ہوئی تھی۔ زہرہ کو سخت ناگوار گذرا تھا کہ شیداں اُس کے خاوند کو اُس سے چھین رہی ہے۔ الھڑ جوان شیداں جس کو معلوم نہیں اُس کا پھیکو بھائی جان اُسے محبت کے کتنے جام پلا چکا تھا، سر سے پیر تک نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں عشق اور جنگ میں ہر ایک چیز جائز ہے وہ خود کو حق بجانب سمجھتی تھی اور پھر خود رفیق اُس کی طرف مائل تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُس کی بڑی بہن معترض کیوں ہے —— چخ زبردست لڑائی کی شکل اختیار کر گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شیداں نے زہرہ کی افیم اُٹھا کر نگل لی تاکہ عشق کی راہ میں اپنی جان دے دے۔ لیکن جس کو اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ وہ شہادت کا رتبہ حاصل کرنے کرتے بچ گئی اور اس حادثے کا انجام بخیر یوں ہوا کہ رفیق، زہرہ کے دل کا مکان خالی کر کے شیداں کے

دل کی نئی کرہٹی ہیں اقامت پذیر ہو گیا۔

سنا ہے کہ تعطیلوں ہیں وہ کبھی کبھی شیدآں کی بستی بہن بیراں کے دل کے ڈاک بنگلے میں بھی ٹھہر جایا کرتا تھا ۔۔۔ بے نام اللہ کا اور اُس کے ایک ناچیز بندے رفیق غزنوی کا۔

جب رفیق کا عشق زوروں پر تھا ، اُس زمانے ہیں لیڈی جمشید جی روڈ ماہم کے گلشن محل ہیں لاہور کے ایک لالہ جی آ کے ٹھہرے آپ کے ساتھ ایک خوبصورت لڑکی زیب النسا تھی ۔ لالہ جی عجیب وغریب آدمی تھے۔ آگ لگانے کو بھی روپیہ کمانی تھا۔ اُن کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ اُن کی زیب پسِ پردہ کیا کرتی ہے ، کیا نہیں کرتی۔ وہ اپنے چند پنے میں مست رہنا چاہتے تھے۔ رفیق دو ایک مرتبہ لالہ جی سے ملنے آیا تو اُس کی آنکھ زیب سے لڑ گئی ۔ لڑکی سادہ لوح تھی۔ غریب نے گھر کی سب اچھی چادریں ، غلاف ، دریاں وغیرہ رفیق کے حوالے کر دیں ۔ اُس کو کھلاتی پلاتی بھی رہی ۔ لیکن رفیق بہت جلد اُس سے اُکتا گیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا ، بڑی شریف عورت ہے ۔۔۔۔ مجھے لطف نہیں آتا۔"

رفیق کو عورت میں شرافت بہت بری طرح کھلتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں ۔ یہی ہو سکتا ہے کہ اُس کا واسطہ چونکہ شروع ہی سے ایک ایسے

طبقے کی عورتوں سے پڑا تھا، فحش کلامی اور جگت بازی جن کا اوڑھنا بچھونا ہوتی ہے، جو سستے اور بازاری قسم کے مذاق کرتی ہیں اور ایسے ہی ہنسی ٹھٹھے کی دوسروں سے توقع کرتی ہیں۔ اس لئے رفیق کے لئے شریف خواتین میں کوئی کشش نہیں تھی ——— اُس کی جسمانی حسیات کو بیدار نہیں کرسکتا تھا۔

کہنے کو تو وہ ہر اُس طوائف کا شوہر تھا جو اُس کی نیم بازارانہ زندگی میں آئی، لیکن درحقیقت وہ اُس کا گاہک تھا ——— عام گاہک نہیں ——— خاص گاہک، (جو طوائف سے لیتا ہے، اُس کو دیتا نہیں) جیسا کہ رفیق اپنی ابتدائی زندگی میں تھا۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ زندگی بھی رفیق کے نزدیک ایک طوائف ہے۔ وہ ہر رات اُس کے ساتھ سوتا ہے۔ صبح اُٹھتے ہی پہلے سانس کے ساتھ وہ اُس سے جگت بازی شروع کردیتا ہے، اُس کا گانا سنتا ہے، اپنا سناتا ہے۔ پھکڑ بازی ہوتی ہے اور یوں ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔

میں نے اُس کو کبھی ملول نہیں دیکھا۔ وہ بے حیائی اور ڈھٹائی کی حد تک ہر وقت خوش رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تندرست ہے۔ اتنی عمر ہونے پر بھی آپ اُسے معمّر نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ جوں جوں

اس کی عمر میں اضافہ ہو رہا ہے وہ جوان ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مجھے کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر سو برس پورے ہونے پر وہ ننھا منا بچہ بن جائے اور انگوٹھا چوسنا شروع کر دے۔

وہ شوا جی پارک میں رہتا تھا۔ شیداں کے مردہ بچہ پیدا ہوا۔ میں اور میری بیوی افسوس کرنے گئے تو ایک عجیب و غریب تماشا دیکھنے میں آیا۔

رفیق فرش پر قراقلی ٹوپی پہنے نماز پڑھنے کے انداز میں بیٹھا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو دوسرے کمرے سے زہرہ سیاہ ماتمی لباس میں نمودار ہوا۔ بال کھلے تھے اور آنکھیں نمناک۔ اس کے ساتھ اس کا شوہر مرزا تھا جو رفیق کے لڑکے کی موت سے بہت متاثر دکھائی دیتا تھا۔ دوسرے کمرے سے شیداں کے رونے کی آواز آئی تو زہرہ لپک کر اندر گئی اور بلند آواز میں اس کو دلاسا دینے لگی۔ میں رفیق کے کے پاس مبہوت بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یا اللہ یہ کیا مذاق ہے۔

رفیق کسی زمانے میں زہرہ کا خاوند تھا۔ اس کے بطن سے رفیق کے دو بچے تھے، جو اس کمرے سے اس کمرے میں جاتے اور کبھی اس کمرے سے اس کمرے میں آتے۔ رفیق اب زہرہ کی بہن شیداں کا شوہر تھا اور زہرہ کا مرزا۔ شیداں، زہرہ کی بہن تھی اور سوت بھی۔ رفیق کے کئی بچے شیداں

کے کیا گنتے تھے۔ بہن کے رشتے سے ظاہر ہے، پروین بھانجی اور محمود بھانجا۔ اور شیراں کے جو مردہ لڑکا پیدا ہوا ہے، وہ زہرہ کا بھانجا۔ پروین اور محمود کا رشتہ رفیق کے نطفے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اِس مردہ لڑکے سے جو ہُوا وہ ظاہر ہے ـــــ رفیق اور مرزا دونوں ایک دوسرے کے ہم زُلف ہوئے ـــــ میں چکرا گیا۔ لیکن رفیق نے بروقت مجھے اِس اُلجھن سے نجات دی اور کہا، "آؤ باہر چلیں"۔

ہم برآمدے میں پہنچے تو رفیق نے قراقلی اُتار کر زور سے ایک طرف پھینکی اور سگرٹ سُلگا کر کہا "دُرِ فتنۂ مُنہ ـــــ غم کرتے کرتے چہرہ ملبوترا ہو گیا ہے"، اور کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

غیرت، شرم اور حیا شاید اضافی چیزیں ہیں۔ آپ مجھ سے بحث کریں گے تو میں مان لوں گا کہ یہ وقتی ہیں۔ بہن بھائی کے ازدواجی رشتے میں کیا قباحت ہے۔ باپ، بیٹی کے جسمانی تعلق میں کیا بُرائی ہے؟ اسی طرح اغلام بازی کو خلافِ وضع فطری عمل کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ جب کہ یہ رجحان انسان کی فطرت میں ازل سے موجود ہے ـــــ کچھ بھی ہو۔ آپ مجھے کمزور کہہ لیجئے، رجعت پسند بنا دیجئے، لیکن ان باتوں کے تصور ہی سے مجھے گھن آتی ہے۔

عرصہ ہُوا، میں ملیبے سے اپنے کسی مقدمے کے سلسلے میں لاہور

آیا۔ ان دنوں رفیقؔ بھی وہیں تھا۔ اُس سے ملاقات سیّد سلامت اللہ شاہ کے بنلام گھر میں ہوئی۔ اللہ بخشے شاہ صاحب بڑے رنگیلے آدمی تھے میں نے اُن سے رفیق کا پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ اندر کمرے میں ہے اور بہت خوش ہے۔

معلوم ہُوا کہ وہ امرتسر میں اپنی بیٹی زرّینہ المعروف نسرینؔ (انوریؔ کے بطن سے) سے ملاقات کر کے آیا ہے۔ رفیق نے اُس کا بچپن دیکھا تھا۔ اُس کی جوانی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہُوا تھا۔ اصل میں انوریؔ نے کوئی ایسا موقعہ ہی نہیں آنے دیا تھا کہ نسرینؔ اپنے باپ کو دیکھ سکتی۔ اُس سے یہی کہا گیا تھا کہ وہ بہت بدصورت اور بدمعاش ہے۔

رفیق کے دوستوں نے مل جُل کر منصوبہ بنایا اور باپ بیٹی کی ملاقات کا انتظام کر دیا۔ رفیق امرتسر پہنچا اور زرّینہ سے ملا۔ رفیقؔ نے مجھ سے کہا "منٹو ——— سرو قد۔ بے حد خوبصورت۔ جوانی سے بھرپور۔ میں نے جب اُسے اپنے بازوؤں میں بھینچا تو خدا کی قسم مزا آگیا!"

میں اُس کے اِن الفاظ پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

رفیق نے مجھے بتایا کہ وہ رخصت ہونے ہی والا تھا کہ انوری

آن ٹپکی - ہلکی سی چیخ ہوئی - رفیق نے اُس سے کہا ۔ خاموش رہ انوری -
--- شکر یہ ادا کر کہ تجھے ایک سونے کی کان کا مالک بنا دیا ہے میں
نے " ---

معلوم نہیں رفیق نے ایسی سونے کی کانیں کس کس کو عطا کی ہیں.
روزِ محشر جب کھدائی ہو گی، اُسی وقت پتا چل سکے گا - ویسے رفیق نے
ایک بار مجھ سے کہا تھا " مجھے معلوم نہیں میرے بچے بچیوں کی تعداد کتنی
ہے --- اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ سب سے بڑا مردم شمار ہے "۔
رفیق کی ایک سگی " بیوی بھی تھی، یعنی سہرے جلووں کی بیاہی - یہ
غریب شادی کے تین چار سال بعد ہی مر گئی - اس کے بطن سے ایک
لڑکی طاہرہ ہے جو پہلے فلم ڈائرکٹر ضیا سرحدی کی بیوی تھی اور اب
طلاق لے کر کراچی میں اپنے باپ کے ساتھ رہتی ہے -
مجھے اس لڑکی کی زندگی کی قبل از وقت تباہی کا بہت افسوس
ہے، اور میں سمجھتا ہوں اس تباہی میں رفیق کا ہاتھ ہے، اس لئے کہ وہ
ہمیشہ اُس کو اپنی زندگی کا سانچہ پیش کرتا تھا اور کہتا تھا، تم اس میں
ڈھل جاؤ - یہ حقیقت اُس کی آنکھوں سے معلوم نہیں کیوں اوجھل رہی؟
نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ آج ایک عبرت انگیز خرابے میں تبدیل ہو
چکی ہے - اُس کی شادی کے متعلق بمبے میں ایک جھگڑا سا پیدا ہو گیا

تھا۔ وہ بھی رفیق کی غفلت کے باعث۔ اس کو دور کرنے کے لئے اُس نے ظاہرہ سے کہا " دیکھ پتّر۔ تو نذیر لدھیانوی سے شادی نہیں کرنا چاہتی نہ کر — ضیا سرحدی سے کر۔ تذبذب میں ہے تو دونوں سے کر لے۔ اگر یہ تجھیں دھوکا دے گئے تو کوئی فکر نہ کرنا — میں تیرا سب سے بڑا خاوند ہوں۔ تیرا باپ۔"

نذیر لدھیانوی کو ظاہرہ نے دھوکا دیا۔ ظاہرہ کو ضیا سرحدی نے۔ اب وہ اپنے سب سے بڑے خاوند — اپنے باپ رفیق غزنوی کے پاس ہے۔ بیٹریاں پیتی ہے اور اُن کی راکھ میں اپنی جوانی کی وہ تمام چلبلاہٹیں کرید کرید کر نکالنے کی ناکام کوشش کرتی ہے جو کوئی مستقل سنجیدہ شکل اختیار کر سکتی تھیں۔

میں ظاہرہ کے متعلق اور کچھ نہیں لکھوں گا اس لئے کہ میرے دُکھ میں اضافہ ہو گا۔

رفیق میں کھلنڈرہ پن اس عمر میں بھی موجود ہے۔ چھوٹی سی بات ہو گی اور وہ ہنس ہنس کر اپنا بُرا حال کر لے گا۔ بہت خوش ہو گا تو اچھلنا کودنا شروع کر دے گا۔

ہم فلمستان میں "چل چل رے نوجوان" بنا رہے تھے۔ ہیرو اشوک اور ہیروئن نسیم بانو دہری چہرہ تھی۔ رفیق اس فلم میں ایک رول ادا

کر رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نسیم کی ماں چھمیاں (شمشاد) کو
جانتا ہے جو کسی زمانے میں دلی کی نہایت حسین طوائف تھی۔

دلی میں ایک رات اُسے چھمیاں کے بالاخانے پر جانے کا اتفاق ہوا۔ چھمیاں گا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ بلوریں صراحی سے جام بھر بھر کے پی رہی تھی۔ مجرا سننے والے اور بھی تھے۔ شہر کے رئیس۔ چھمیاں اُس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور اشارے سے اپنے پاس بلا کر ایک جام پیش کیا ـــــ رئیس پیچتے گئے اور وہ پندرہ روز تک اُس کے بالاخانے میں زیرِ حراست رہا۔

میں نے نسیم سے اُس کا تعارف کرایا۔ رفیق نے اُس کو جب دلی میں دیکھا تو وہ چھوٹی سی بچی تھی جو بقول رفیق ہر وقت چینر باوٹے سے ادھر اُدھر پھدکتی رہتی تھی۔

نسیم، رفیق کو جانتی تھی۔ ان میں جو گفتگو ہوئی بہت پُرتکلف تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نسیم ادب آداب اور رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھتی ہے۔ اُس نے رفیق کو ایسا کوئی موقعہ نہ دیا کہ وہ "ڈھیلی" قسم کی بات کر سکتا۔ لیکن وہ اسی میں خوش تھا۔ اتنا خوش کہ میرے کمرے میں پہنچتے ہی اُس نے بے تحاشا ناچنا شروع کر دیا۔ نسیم کے حسن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا وہ میز پر چڑھا۔ وہاں سے دھم کر کے فرش

پر گرا اور لوٹنے لگا۔ لوٹتے لوٹتے میز کے نیچے چلا گیا۔ اُٹھا تو اُس کا سر تڑاق سے اُس کے ساتھ ٹکرایا۔ اس کی پروا نہ کرتے ہوئے اُس کے نیچے سے نکلا اور گانے لگا۔ ؎

وہ چلے، جھٹک کے دامن مرے دستِ ناتواں سے
وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ چلے ۔۔۔ وہ چلے ۔۔۔ وہ چلے

میرا خیال ہے رفیق چاہتا تھا کہ نسیم بانو سے بھی سلسلہ ہو جائے، مگر انگور کھٹے تھے، اس لئے اُس نے کوشش فضول سمجھی اور دور سے دیکھ دیکھ کر ہی اپنا "جی پشوری" کرتا رہا۔

نورجہاں غالباً اُس کے ہتھے چڑھ جاتی، لیکن وہ بہت بُری طرح فلم ڈائرکٹر سید شوکت حسین رضوی کی محبت میں گرفتار تھی۔ جس کے متعلق کسی قدر تفصیل سے اپنے مضمون "نورجہاں سرورجہاں" میں لکھ چکا ہوں۔ البتہ رفاقتِ ستارہ بغیر رفیق کی خواہش کے اور بغیر اپنے ارادے کے سرفراز ہو گئی۔

اروڑہ اور اُس کا جھگڑا تھا۔ بیچ میں نذیر (ایکٹر) بھی تھا۔ اس تگڈم کی گرہیں کھولتے کھولتے رفیق نے ستارہ کی گرہ بھی کھول دی۔ کچھ اس طرح کہ اس کا پتہ رفیق کو چلا نہ ستارہ کو۔

سہراب مودی "سکندر" بنا رہا تھا۔ ظہور احمد "پون پل" (بمبئی

میں جسم فروشوں کی منڈی سے ایک نووارد اور نوجوان طوائف مینا کو لے اڑا تھا۔ اُس نے اِس نوخیز کو اپنی بیوی بنا لیا تھا۔ وہ منزوا مووی ٹون میں ملازم تھی۔ رفیق غزنوی نے "سکندر" کے لئے ایک مارشل کورس مرتب کیا۔ اس کے بول شاید یہ تھے۔

زندگی ہے پیار سے، پیار سے بتائے جا
حسن کے حضور میں اپنا سر جھکائے جا

یہ کورس بہت مقبول ہوا۔ شاید اسی خوشی میں اُس نے مینا کے حسن کے حضور میں اپنا سر جھکا دیا، مگر زیادہ دیر تک جھکائے نہ رکھا تین چار سجدے کئے اور مصلّے اُٹھا کر چل دیا۔

پونا ہی میں حیدر آباد سے دو بہنیں غالباً شہزادہ معظّم جاہ سے اپنی جان چھڑا کر آباد ہوئیں۔ بڑی کا نام اختر تھا چھوٹی کا انور۔ اِن کا وطن در اصل آگرہ تھا۔ انور بالی عمر کی تھی۔ یہی کوئی چودہ پندرہ برس کی۔ دونوں مجرا کرتی تھیں۔ انور کی مِسّی کی رسم ابھی تک ادا نہیں ہوئی تھی۔ بڑی پر ہمارے دِلّی کے ایک دوست ملہد یہ صاحب سو جان سے فدا تھے۔

ایک رات مجھے ملہد یہ صاحب کے ساتھ ان دو بہنوں کے بالاخانے پر جانے کا اتفاق ہوا۔ مجرا سننے کے بعد باتیں شروع ہوئیں تو رفیق غزنوی

کا ذکر آیا۔ میں نے کہا "بڑا حرامزادہ ہے۔"

چھوٹی دانورن نے ایک تیکھی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا "آپ کی شکل اُس سے ملتی جلتی ہے۔"

مجھ سے کوئی جواب بن نہ آیا اور پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔

اس واقعے کا ذکر میں نے رفیق سے کیا۔ وہ اُن کو نہیں جانتا تھا۔ مجھ سے پتہ پوچھ کر اُس نے اُن کے یہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ میرا خیال ہے یہ سلسلہ کم از کم ایک برس تک جاری رہا۔ رفیق نے پیشگوئی کی کہ انور ایک دن بہت بڑی مغنیہ بنے گی اور ٹھمری گانے میں اُس کا کوئی جواب نہ ہوگا۔ یہ صحیح ثابت ہوئی۔ جن لوگوں نے اُسے سُنا ہے اِس کی تصدیق کریں گے۔

برسوں کے بعد میں نے انور بائی آگرے والی کو دلّی ریڈیو سٹیشن میں دیکھا جہاں میں اُن دنوں ملازم تھا ---- ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔ اللہ اللہ کیا انقلاب تھا۔ چند برسوں ہی میں یہ کایا پلٹ ---- پن پل کا وہ چلبلاپن، وہ شربہ اور تیکھا غمزہ معلوم نہیں کون ظالم اُس کے وجود سے نوچ کر لے گیا تھا۔ اب وہ ایک لمبی آہ تھی، بڑی نازک ہوا کے ہلکے سے ہلکے ریلے سے بھی جس کے ہزار ٹکڑے ہو سکتے تھے۔ مائیکروفون کے سامنے گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھی اور تانپورے کے

کے ساتھ اپنی سر لگا دیتی کہ اُس کی نحیف گردن کو سر کا سا را بوجھ نہ اُٹھانا پڑے ـــــ پھر وہ گاتی اور اُس کی آواز سننے والوں کی رُوح کی گہرائیوں میں اُتر جاتی۔

رفیق گویا کم ہے اور زیادہ ہے۔ وہ آپ کو اپنا گانے سُنانے سے پہلے ہی وجد میں لے آئے گا۔ باجے کے کسی سر پہ اُنگلی رکھے گا اور خود پر سرتاپا رقت طاری کر کے کہے گا "ہائے" یہ ہائے بہت لمبی ہوگی۔ پھر وہ دوسرے سُر کو دبائے گا اور اس سے بھی لمبی "ہائے" اُس کے حلق سے نکلے گی جو سامعین کے رونگٹے کھڑے کر دے گی۔ اس کے بعد وہ باجے میں مزید ہوا بھرے گا۔ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں اُوپر چڑھ جائیں گی ایک جگہ دو تین آہ اُس کے سینے کی گہرائیوں سے نکلے گی اور جب وہ کسی اور سُر پہ اُنگلی رکھے گا تو اُس پہ حال کی کیفیت طاری ہو جائے گی قریب ہوگا کہ سننے والے اپنے کپڑے پھاڑنے اور سر کے بال نوچنے لگیں کہ ایکدم وہ بے تحاشہ ہنسنا شروع کر دے گا اور باقاعدہ گانے لگے گا۔ آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ پیاسی زمین پہ ساون کی جھڑی کھل کر برس جانے کے بعد کوئی ماشکی اپنی مشک سے چھڑکاؤ کر رہا ہے۔

گاتے وقت بہت برے برے منہ بناتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اُسے قبض ہے۔ اُس کے پیٹ میں شدت کا درد ہے جس کے باعث وہ

پیچ و تاب کھا اور کراہ رہا ہے۔ اُس کو گاتے دیکھ کر (خاص طور پر جب وہ کوئی پکا گانا گا رہا ہو) یا تو خود آپ کو تکلیف ہو گی یا اُس کی حالت پہ ترس آنے لگا اور آپ خلوص دل سے دعا کریں گے کہ خدا اُسے اس کرب سے نجات دلائے۔

عذرا میر نے بمبے کے بہت دولت مند یہودیوں سے مل کر لاکھوں کے سرمائے سے ایک فلم کمپنی قائم کی تو اپنے پہلے فلم "ستارہ" کے میوزک کے لئے رفیق غزنوی کو منتخب کیا۔ عذرا میر خوبصورت ہے۔ اُس کے ساتھی، یہودی سرمایہ دار بھی خوش شکل اور رعب داب والے تھے۔ رفیق جب ان کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا تو بالکل الگ نظر آتا تھا۔ اُس کی شان ہی دوسری تھی۔

رفیق جب کام شروع کرتا ہے تو بڑے ٹھاٹ سے۔ ایک سو سازندے ہوں گے جن کے جھرمٹ میں کھڑا وہ سب کو ہدایات دے رہا ہو گا۔ پنجابی میراثیوں کے ساتھ میراثی بن جائے گا۔ بات بات پہ پھبتی اور جگت۔ جو کرسچین ہیں، اُن سے انگریزی میں مذاق ہوتے رہیں گے۔ جو یو۔پی کے ہوں گے اُن سے اُردو میں "شستہ کلامی" ہو گی۔

ایک دن رفیق دفتر میں عذرا میر کے ساتھ بیٹھا فلم کے کسی گانے کے متعلق تبادلۂ خیالات کر رہا تھا۔ میں بھی پاس بیٹھا تھا۔ کوئی بات کرنے

کہتے وہ فوراً اُٹھ گیا۔ دفتر سے دُور میوزک روم تھا۔ وہاں سازندے
اُس کی ایک کمپوزیشن کی ریہرسل کر رہے تھے۔ رفیق نے اپنے کان
کا رُخ اُس طرف کیا جہاں سے آواز آرہی تھی اور ناک بھوں چڑھا کر
بڑے اذیت بھرے لہجے میں کہا "ڈیش اِٹ ــــ ایک دائلن
آؤٹ آف ٹیون ہے!" اور اٹھ کر میوزک روم کی طرف چلا گیا۔

مجھے موسیقی سے کوئی شغف نہیں۔ گو میں نے اپنے وقت کے
تمام بڑے بڑے گانے والوں اور گانے والیوں کو سنا ہے، لیکن
راگ دوبا نہیں سیکھ سکا۔ لیکن میں رفیق کے متعلق اتنا ضرور کہہ سکتا
ہوں کہ وہ سُر پایا نہیں۔ موسیقی کا علم وہ کہاں تک جانتا ہے اس کے
بارے میں رائے دینا میری طرف سے بہت بڑی زیادتی ہوگی۔
البتہ وہ لوگ جو خود موسیقار ہیں اور جن کا موسیقی کے میدان میں کافی
نام ہے، اُن میں سے اکثر کا یہ کہنا ہے کہ رفیق بے سُرا ہے۔ سُر سے
ایک ایک دو دو "سوتر" ہٹ کے گاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تھوڑے ہی دن ہوئے نورجہاں سے باتیں ہو رہی تھیں کہ
رفیق کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے اُس سے رفیق کے بارے میں دوسروں
کی مندرجہ بالا تنقیص کا ذکر کیا تو اُس نے حسبِ عادت زبان تلے دبا کر
اور دونوں کانوں کو اپنی انگلیوں سے چھوتے ہوئے کہا "توبہ، توبہ

—— یہ محض افترا ہے —— وہ اُستاد ہے۔ اپنی طرز کا واحد مالک۔"

لیکن اُس نے یہ تسلیم کیا کہ اب رفیق کی آواز میں وہ پہلی سی چہک دمک نہیں رہی اور یہ محض عمر کا تقاضا ہے، جہاں تک علم کا تعلق ہے نورجہاں اُس سے گُنی کھنی ہے۔

اُس کے ایک گُن کا میں بھی معترف ہوں۔ وہ بے شرم ہے، بے حیا ہے۔ بے غیرت ہے، لیکن اوباش نہیں۔ اُس کی افتاد عام آدمی کی نہیں ایک آرٹسٹ کی افتاد ہے۔ وہ اگر شریعت کا پابند نہیں تو مروّجہ قوانین کا پابند ضرور ہے۔ وہ اگر کسی کا دوست نہیں تو کسی کا دشمن بھی نہیں۔ وہ اگر صحیح معنوں میں کسی عورت کا شوہر نہیں تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں آج تک اُس نے کسی عورت کو مجبور نہیں کیا کہ وہ صحیح معنوں میں اُس کی بیوی بنے۔

شریف عورتیں چونکہ اُس کی مطلب کی نہیں اس لئے وہ اُن کا احترام کرتا ہے۔ غیر شریف عورتیں چونکہ اُس کو اچھی لگتی ہیں اس لئے وہ اُن کی بے حرمتی کرتا ہے۔ بینک میں روپیہ ہو تو اچھے اور شاندار کپڑے پہننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ بینک بیلنس خالی ہو تو اچھے اور شاندار کپڑے پہننا ضروری سمجھتا ہے۔

دلّی کے ایک معزز ہندو خاندان کی ایک تعلیم یافتہ نوجوان دوشیزہ

کہ اُس سے محبت ہو گئی۔ دیر تک وہ رفیق کو عشقیہ خط لکھتی رہی رفیق
سمجھے ہیں تھا کہ اُس کا ایک ایسا خط آیا کہ رفیق پریشان ہو گیا۔ مجھے
بڑی حیرت ہوئی کہ رفیق اور پریشانی۔ دو متضاد چیزیں ؟

رفیق نے مجھے ساری ماجرا کہانی سنائی اور کہا "منٹو یہ لڑکی پاگل ہو گئی ہے۔ میں ایک ہرجائی مرد ہوں۔ مجھے اس افلاطونی محبت سے کیا واسطہ۔ کہتی ہے گھر سے بھاگ کر میرے پاس آجائے گی ———— آجائے اٹھیک ہے۔ لیکن میں کب تک اُس کی شریف اور پاکیزہ محبت سے چپکا رہوں گا ——— خدا کے لئے تمام شریف عورتیں اپنے گھر میں رہیں۔ شادی کریں۔ بچے جنیں اور جائیں جہنم میں مجھے اُن کا عشق درکار نہیں۔ میری ساری عمر گذر گئی گھوڑے سکے چلاتے۔ گھوڑے مجھ سے نہیں چلیں گے"

چنانچہ رفیق نے اس مہارد دوشیزہ کو ایسا دلشکن خط لکھا کہ وہ اپنے ارادے سے باز آگئی۔

رفیق پر یہ میرا مضمون تشنہ ہے۔ مجھے اس کا شدید احساس ہے اُس پر کسی اخبار، رسالے یا کتاب کے لئے جب بھی کوئی مضمون لکھے گا تشنہ ہی رہے گا۔ اِس لئے کہ اُس کی ہزار پہلو شخصیت کا احاطہ چند صفحات نہیں کر سکتے۔ زندگی رہی تو میں اپنے تاثرات قلم بند کر کے

ایک مکمل کتاب کی صورت میں پیش کروں گا۔

آخر میں ایک لطیفہ سُن لیجئے۔

فلم "چل چل رے نوجوان" کے زمانے میں رفیق نے پروڈیوسر ایس مُکرجی - ڈائرکٹر گیان مکرجی۔ اشوک کمار، سنتوشی، شاہد لطیف اور میری دعوت کی۔ ہم سب رفیق کے مکان واقع شواجی پارک پہنچے۔ رفیق ہلکے ہلکے سرور میں ہارمونیم سامنے رکھے فرش پر بیٹھا تھا۔ پاس ہی شہناز تھی اور اُس کا بھائی۔ ہم پہنچے تو اُس نے ہمارا استقبال کیا۔ میرا گالیوں سے اور باقیوں کا سلاموں سے۔

شراب کے دو تین دَور چلے۔ دوسروں کو اُس نے اسکاچ دی اور مجھے "سولن" کی یعنی دلیسی۔ میں خاموش رہا۔ وہ حسبِ عادت بات بات پر مجھے گالیاں دیتا رہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کھانا لگایا گیا۔ حسبِ معمول اُس نے مرغے کے گوشت کے اچھے اچھے ٹکڑے نکالکر اپنی پلیٹ میں رکھ لئے۔

کھانا کھانے کے بعد ایک ایک کرکے سب چلے گئے میں بیٹھا رہا۔ شہناز اندر جاکے سو گئی۔ رفیق زیادہ پینے کا عادی نہیں۔ وہ پہلے ہی سے بمبئی کی زبان میں "چکار" تھا۔ مرغن کھانوں سے اُس کی آنکھیں مُندنے لگیں۔ میں چپکے سے اُٹھا، دوسرے کمرے میں جاکر برہنے

اطمینان سے الماری کھولی اور اسکاچ کی بوتل اُٹھا لایا۔ آدمی سے
کچھ زیادہ تھی۔ میں آرام سے پیتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے سالے
کو بھی دیتا رہا۔ کبھی کبھی رفیق کو اُکسا دیتا اور وہ غنودگی کے عالم میں چند
لکنت بھری گالیاں منہ سے اُگل دیتا۔

اب میں نے جو مغلظات بکنا شروع کیں تو رفیق بلبلا اٹھا۔ میری
گالیوں کی فہرست کوئی اتنی لمبی چوڑی نہیں۔ دو تین بار منہ بھرا تو
ختم ہو گئیں۔ میں نے یہ استادی کی کہ ایک گالی آدھی کرتا اور دوسری
آدھی گالی کے ساتھ جوڑ کر لڑھکا دیتا۔ اس ترکیب سے بھی زیادہ دیر
تک کام نہ چلا۔ لیکن میں نے سوچا کم بخت کو ہوش کہاں ہے جو الم غلم
منہ میں آئے نکال باہر پھینکو۔ چنانچہ میں نے یہی کیا۔ رفیق نشے میں چور
پیچ و تاب کھاتا رہا۔ آخر اس نے مردہ آواز میں کہا "جانے دو منٹو میری
جان ---- میں تھک گیا ہوں۔ مجھ میں اب گالیاں دینے کی سکت نہیں
ہے۔

میں یہی تو چاہتا تھا کہ اس میں سکت نہ ہو، ورنہ میں اور اس کے
مقابلے کی جرأت کرتا؟

میں نے اس پر یہ مضمون لکھا ہے جسے پڑھ کر وہ یقیناً اپنے
مخصوص انداز میں مجھے بڑی نستعلیق گالیاں دے گا ـــــ لیکن میں لاہور

میں ہوں، وہ کراچی میں۔ فی الحال تو محفوظ ہوں۔ لاہور آئے گا تو میں اُس کی مغلظات سن لوں گا۔ پھر اُس کی دعوت کردوں گا اور جم خانہ وسکی میں اسپرٹ گھول کر...... خود پی لوں گا۔

پارو دیوی

"چل چل رے نوجوان" کی ناکامی کا صدمہ ہمارے دل و دماغ سے قریب قریب مندمل ہو چکا تھا۔ گیان مکرجی، فلمستان کے لئے ایک پروپیگنڈا کہانی لکھنے میں ایک عرصے سے مصروف تھے۔

کہانی لکھنے لکھانے اور اسے پاس کرانے سے پیشتر نلنی جیونت اور اس کے شوہر وریندر ڈیسائی سے کنٹریکٹ ہو چکا تھا۔ غالباً پچیس ہزار روپے، ایک سال اس کی میعاد تھی۔ مسٹر ششودھر مکرجی حسب عادت سوچ بچار میں دس مہینے گذار چکے تھے۔ کہانی کا ڈھانچہ تھا کہ تیار ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ بصد مشکل جوں توں کر کے ایک خاکہ معرض وجود میں آیا۔ جسے گیان مکرجی اپنی جیب میں ڈال کر دہلی روانہ ہو گئے تاکہ زبانی

طور پر اس میں کچھ اور چیزیں ڈال کر حکومت سے پاس کرالیں۔

خاکہ پاس ہو گیا، جب شوٹنگ کا مرحلہ آیا تو دریندر ڈیسائی نے یہ مطالبہ کیا کہ اس کے ساتھ ایک برس کا اور کنٹریکٹ کیا جائے۔ اس لئے کہ پہلے معاہدے کی میعاد ختم ہونے والی ہے۔ رائے بہادر چونی لال مینجنگ ڈائرکٹر بڑے اکھڑ قسم کے آدمی تھے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ مقدمہ بازی ہوئی۔ فیصلہ دریندر ڈیسائی اور ان کی خوبرو بیوی نلنی کے حق میں ہوا۔ اس طرح پروپیگنڈا فلم جس کی کہانی کا ابھی صرف غیر مکمل خاکہ ہی تیار ہوا تھا پچیس ہزار روپوں کے بوجھ تلے آ گئی۔

رائے بہادر کو بہت عجلت تھی کہ فلم جلد تیار ہو، کیونکہ بہت وقت ضائع ہو چکا تھا، چنانچہ جلدی جلدی میں ولی صاحب کو بلا کر ان کی بیوی ممتاز شانتی سے کنٹریکٹ کر لیا گیا اور اس کو چودہ ہزار روپے بطور پیشگی ادا کر دیئے گئے (بلیک میں یعنی بغیر رسید)۔

دو دن شوٹنگ ہوئی۔ ممتاز شانتی اور اشوک کمار کے درمیان مختصر سا مکالمہ تھا جو بڑی مین میخ کے بعد فلمایا گیا، مگر جب اسے پردے پر دیکھا گیا تو سب نے ممتاز شانتی کو ناپسند کیا۔ اس ناپسندیدگی میں اس بات کا بھی بڑا دخل تھا کہ ممتاز برقع پہن کر آتی تھی اور ولی صاحب نے صاف طور پر مکرجی سے کہہ دیا تھا کہ اس کے جسم کو کوئی ہاتھ نہ لگا

نہیں لگائے گا۔

نتیجہ یہ ہُوا کہ ممتاز شانتی کو فلم سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس بہانے سے کہ جو کردار اسے اس کہانی میں ادا کرنا ہے، اس کے لئے مناسب و موزوں نہیں — کیونکہ اس میں ایسے کئی مقام آئیں گے جہاں ہیروئن کو اپنے جسم کے بعض حصّوں کی عُریاں نمائش کرنا پڑے گی — قصّہ مختصر کہ یہ چودہ ہزار بھی گئے۔

اب کہانی کا نامکمل ڈھانچہ اُنتالیس ہزار روپے کے نیچے دبا پڑا تھا — رائے بہادر چونی لال، لال پیلے ہو رہے تھے۔ "چل چل رے نوجوان" کی ناکامی نے کمپنی کی حالت بہت پتلی کر دی تھی۔ مارواڑیوں سے قرض لے لے کر گذارہ بصد مشکل ہو رہا تھا۔ رائے بہادر کی خفگی اور پریشانی بجا تھی۔

ایک دن میں، واچا، پائی اور اشوک اسٹوڈیو کے باہر کرسیوں پر بیٹھے کمپنی کی انہی حماقتوں کا ذکر کر رہے تھے جن کے باعث اتنا وقت اور اتنا روپیہ ضائع ہوا، کہ اشوک نے انکشاف کیا کہ جو چودہ ہزار رائے بہادر نے ممتاز شانتی کو دیئے تھے وہ انھوں نے اس سے قرض لئے تھے۔ اشوک نے یہ انکشاف اپنی کالی پنڈلی کو کھجلاتے ہوئے کچھ اس انداز سے کیا کہ ہم سب بے اختیار ہنس پڑے۔ لیکن فوراً ہی ہم

چپ ہو گئے۔

سامنے بجری بچھی روش پہ ایک اجنبی عورت ہماری بھاری بھر کم ہیئر ڈریسر کے ساتھ میک اپ روم کی طرف جا رہی تھی۔

ونارام پائی نے اپنے کالے، موٹے اور بدشکل ہونٹ وا کئے اور خوفناک طور پر آگے بڑھے ہوئے اونا ٹیڑھے میلے دانتوں کی نمائش کی۔ اور واآچا کو کہنی کا ٹھوکا دے کر اشوک سے مخاطب ہوا "یہ ––– یہ کون ہے؟"

واآچا نے پائی کے سر پر ایک دھول جمائی "سالے تو کیوں پوچھتا ہے ––– ؟"

پائی بدلہ لینے کے لئے اٹھا تو واآچا نے اس کی کلائی پکڑ لی "بیٹھ جا سالے ہٹ جا اُدھر ––– تیری تو شکل دیکھتے ہی بھاگ جائے گی۔"

پائی اپنے اونا ٹیڑھے دانت پیستا رہ گیا۔ اشوک جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا، بولا "شکل صورت سے تو اچھی خاصی ہے۔"

میں نے ایک لحظے کے لئے غور کیا اور کہا "ہاں ––– نظروں پر گراں نہیں گزرتی۔"

اشوک میرا مطلب نہ سمجھا "کہاں سے نہیں گزرتی۔"

میں مسکرایا "میرا مطلب یہ تھا کہ جو عورت یہاں سے گذر گئی ہے، اسے دیکھ کر آنکھوں پر بوجھ نہیں پڑتا —— بڑی صاف ستھری ہے لیکن قد کی ذرا چھوٹی ہے"

پائی نے پھر اپنے دانتوں کی نمائش کی "ارے —— چلے گی —— کیوں واچا؟"

واچا، پائی کے بجائے اشوک سے مخاطب ہوا "دادامنی! تم جانتے ہو یہ کون ہے؟"

اشوک نے جواب دیا "زیادہ نہیں جانتا، مکرجی سے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ ایک عورت ٹسٹ کے لئے آج آنے والی ہے"

کیمرہ اور ساؤنڈ ٹسٹ لیا گیا جسے ہم سب نے پردے پر دیکھا اور اپنی اپنی رائے دی۔ مجھے، اشوک اور واچا کو وہ بالکل پسند نہ آئی۔ اس لئے کہ اس کی جسمانی حرکات "چوبی" تھیں۔ اُس کے اعضا کی ہر جنبش میں تصنع تھا۔ مکالمہ ادا کرتے وقت اس کے ابرو بشبہ در رقاصاؤں کی طرح ناچتے تھے۔ مسکراہٹ بھی غیر دلکش تھی —— لیکن پائی اس پر لٹو ہو گیا۔ چنانچہ اس نے کئی مرتبہ اپنے بدنما دانتوں کی نمائش کی اور مکرجی سے کہا کہ "ونڈرفل اسکرین فیس" ہے۔

وتمارام پائی، فلم ایڈیٹر تھا۔ اپنے کام کا ماہر، فلمستان چونکہ ایک

ایسا ادارہ تھا جہاں ہر شعبے کے آدمی کو اظہارِ رائے کی آزادی تھی اس لئے وقتاً فوقتاً ہر آئی ڈی سب بے وقت اپنی رائے سے ہم لوگوں کو مستفید کرتا رہتا تھا اور خاص طور پر میرے تمسخر سے دوچار ہوتا تھا۔

ہم لوگوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ لیکن ایس مکرجی نے اس عورت کو جس کا نام پارو تھا، پروپیگنڈا فلم کے ایک رول کے لئے منتخب کر لیا۔ چنانچہ رائے بہادر چونی لال نے فوراً اس سے ایک فلم کا کنٹریکٹ معمولی سی ماہانہ تنخواہ پر کر لیا۔

اب پارو ہر روز اسٹوڈیو آنے لگی۔ بہت ہنس مکھ اور گھل مٹھو ہو جانے والی طوائف تھی۔ میرٹھ اس کا وطن تھا جہاں وہ شہر کے قریب قریب تمام رنگین مزاج رئیسوں کی منظورِ نظر تھی۔ ہزاروں میں کھیلتی تھی، پر اسے فلموں میں آنے کا شوق تھا۔ چنانچہ یہ شوق اسے کھینچ کر فلمستان میں لے آیا۔

جب اس سے کھل کے باتیں کرنے کا موقعہ ملا تو معلوم ہوا کہ حضرت جوش ملیح آبادی اور مسٹر ساغر نظامی بھی اکثر اس کے ہاں آیا جایا کرتے تھے اور اس کا مجرا سنتے تھے۔

اس کی زبان بہت صاف تھی، اور جلد بھی، جس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ چھوٹی آستینوں والے پھنسے پھنسے بلاؤز میں سے اس

کی ننگی باہیں ہاتھی کے دانتوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں ——— سفید، سڈول، متناسب اور خوبصورت۔ جلد میں ایسی چکنی چمک تھی جو دیودار لکڑی پر رندہ پھیرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ صبح اسٹوڈیو آتی تو نہائی دھوئی صاف ستھری، اُجلی، سفید یا ہلکے رنگ کی ساری میں ملبوس۔ شام کو جب گھر روانہ ہوتی تو دن گزرنے کے گرد و غبار کا ایک ذرہ تک اس پہ نظر نہ آتا۔ ویسی ہی تر و تازہ ہوتی جیسی صبح کو تھی۔

دتّا رام پائی اس پہ اور زیادہ لٹو ہو گیا۔ شوٹنگ شروع ہوئی نہیں تھی، اس لئے اسے فراغت ہی فراغت تھی، چنانچہ اکثر پارو کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول رہتا ——— معلوم نہیں وہ اس کے بھونڈے اور کرخت لہجے، اس کے اوندھے سیدھے میلے دانتوں اور اس کے اَن کٹے میل بھرے ناخنوں کو کیسے برداشت کرتی تھی ——— صرف ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ طوائف اگر برداشت کرنا چاہے تو بہت کچھ برداشت کر سکتی ہے۔

پروپیگنڈا فلم کی کہانی کا ڈھانچہ میرے حوالے کیا گیا کہ میں اس کا بغور مطالعہ کروں اور جو ترمیم و تنسیخ میری سمجھ میں آئے بیان کروں۔ میں نے اس ڈھانچے کے تمام جوڑ دیکھے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسا بے جوڑ ڈھانچہ شاید ہی کسی سے تیار ہو سکے۔ کوئی سر تھا نہ پیر، لیکن

چونکہ میری قابلیت اور ذہانت کا امتحان تھا۔ اس لئے میں نے اپنا ڈھانچہ تیار کیا۔ بڑے خلوص اور بڑی محنت سے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ کہ ڈائرکشن کے فرائض ساوک واچا کر سونپے جانے والے تھے جو میرا عزیز دوست تھا۔

نیا ڈھانچہ جب فلمستان کی ذیلی بنچ کے سامنے پیش ہوا تو میری وہ حالت تھی جو کسی مجرم کی ہو سکتی ہے۔

ایس مکر جی نے اپنا فیصلہ ان چند الفاظ میں دیا، "ٹھیک ہے، مگر اس میں اصلاح کی ابھی کافی گنجائش ہے۔"

گیان مکر جی سے پوچھا گیا تو انھوں نے اپنی عادت کے مطابق منہ سکوڑ کر صرف اتنا کہا، "آل موسٹ ٹھیک ہے" — یہ وہ حضرت تھے جو ایس مکر جی کے ڈائرکٹ کئے ہوئے تمام فلموں کے ڈائرکٹر تھے؛ حالانکہ انھوں نے اپنی زندگی میں ایک فٹ فلم بھی ڈائرکٹ نہیں کی تھی۔

اصل میں فلمستان میں کام کرنے کا ڈھب ہی نرالا تھا۔ سارا فلم آپ نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ لیکن پردے پر نام میرا دیا جا رہا ہے۔ کہانی میں نے لکھی ہے، لیکن اس کا مصنف آپ کو بنا دیا گیا ہے۔ بات یہ تھی کہ وہاں سب مل جل کر کام کرتے تھے۔ آپ اس سے اندازہ کر لیجئے کہ

دتارام پائی جسے معلوم ہی نہیں تھا کہ فلمی کہانی کیا ہوتی ہے مجھے مشورے دیا کرتا تھا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ فلم کی کہانی لکھنے کی دشواریاں کچھ وہی سمجھ سکتا ہے جس نے کبھی ایسی کہانی لکھی ہو۔ سب سے زیادہ مشکل میرے لئے یہ تھی کہ مجھے پارو کو اس کی شکل وصورت، اس کے قد اور اس کی فنی کمزوریوں کے پیش نظر اس کہانی میں داخل کرنا تھا۔ بہرحال بڑی مغز پاشیوں کے بعد تمام مراحل طے ہو گئے اور کہانی کی نوک پلک نکل آئی اور شوٹنگ شروع ہو گئی۔

ہم نے باہم مشورہ کرکے یہ طے کیا کہ جن مناظر میں پارو کا کام ہے وہ سب سے آخر میں فلمائے جائیں۔ تاکہ پارو فلمی فضا سے اور زیادہ مانوس ہو جائے اور اس کے دل ودماغ سے کیمرے کی جھجک نکل جائے۔

کسی منظر کی بھی شوٹنگ ہو، وہ برابر ہمارے درمیان ہوتی۔ دتارام پائی اب اس سے اتنا کھل گیا تھا کہ باہم مذاق بھی ہونے لگے تھے۔ پائی کی یہ چھیڑ چھاڑ مجھے بہت بھونڈی معلوم ہوتی۔ چنانچہ میں پارو کی عدم موجودگی میں اس کا تمسخر اڑاتا۔ کم بخت بڑی ڈھٹائی سے کہتا "سالے تو کیوں جلتا ہے؟"

جیسا کہ میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں، پارو بہت ہنس مکھ

اور گھر آمشٹو ہو جانے والی طوائف تھی۔ اسٹوڈیو کے ہر کارکن سے وہ اونچ نیچ سے بے پروا بڑے تپاک سے ملتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت تھوڑے عرصے میں مقبول ہو گئی۔ نچلے طبقے نے اسے احتراماً پارو دیوی کہنا شروع کر دیا۔ یہ اتنا عام ہوا کہ فلم کے عنوانات میں پارو کے بجائے پارو دیوی لکھا گیا۔

دتّا رام پائی نے ایک قدم اور بڑھایا۔ کچھ ایسی ٹپس لڑائی کہ ایک دن اس کے گھر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھا، پارو سے اپنی خاطر مدارت کرائی اور چلا آیا۔ اس کے بعد اس نے ہفتے میں ایک دو مرتبہ باقاعدگی کے ساتھ پارو کے یہاں جا دھمکنا شروع کر دیا۔

پارو اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ادھیڑ عمر کا ایک مرد رہتا تھا جو قد و قامت میں اس سے دوگنا تھا۔ میں نے دو تین مرتبہ اسے پارو کے ساتھ دیکھا —— وہ اس کا پتی دیو کم اور "تھامو" زیادہ نظر آتا تھا۔

پائی ایسے فخر و ابتہاج سے کلینٹن میں پارو سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر نیم عاشقانہ انداز میں کرتا کہ ہنسی آجاتی۔ میں اور سلوک واچا اس کا خوب مذاق اُڑاتے۔ مگر وہ کچھ ایسا ڈھیٹ تھا کہ اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی پارو بھی موجود ہوتی۔ میں اس کی موجودگی میں بھی پائی کے

خام اور بھونڈے عشق کا مذاق اڑاتا۔ پارو برا نہ مانتی اور مسکراتی رہتی اس مسکراہٹ سے اس نے میرٹھ میں جانے کتنے دلوں کو غلط فہمی میں مبتلا کیا ہوگا۔

پارو میں عام طوائفوں ایسا چڑکیلا یا چھچھوراپن نہیں تھا۔ وہ مہذب محفلوں میں بیٹھ کر بڑی شائستگی سے گفتگو کر سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ میرٹھ میں اس کے یہاں آنے جانے والے ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں ہوتے تھے، بلکہ ان کا تعلق سوسائٹی کے اس طبقے سے تھا جو کبھی کبھی ناشائستگی کی طرف محض تفریح کے طور پر مائل ہوا کرتا ہے۔

پارو اب اسٹوڈیو کی فضا میں بہت اچھی طرح گھل مل گئی تھی۔ فلمی دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی عورت یا لڑکی نئی نئی ایکٹرس بنتی ہے تو اس کو کوئی نہ کوئی فوراً دبوچ لیتا ہے۔ لیکن پارو کے ساتھ ایسا نہ ہوا۔ شاید اس لئے کہ فلمستان دوسرے نگار خانوں کے مقابلے میں بہت حد تک "پاکباز" تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پارو کو کوئی اتنی زیادہ جلدی نہیں تھی۔

محسن عبداللہ (پُراسرار نینا کا خاوند) اپنی یک آہنگ، خشک مجرد زندگی سے اکتا کر، پارسی لڑکی ویرا کو جس کی زندگی اسی کی زندگی

کے مانند سپاٹ تھی شریکِ حیات بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چنانچہ اس غرض کے لئے اسے ہمارے ساتھ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا پڑتا پڑا، کیونکہ ویرا فرسٹ کلاس میں آتی جاتی تھی۔ اس کے بعد اس کو وایٹی کیٹ کے مطابق آتے جاتے اس کی کنیا کی زنجیر تھامنا پڑی ——— عاشقوں کے امام میاں مجنوں کو بھی تو لیلیٰ کی کنیا عزیز تھی۔

داپاکو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے بڑی مشکلوں سے تازہ تازہ اپنی بدکار فرانسیسی بیوی سے نجات حاصل کی تھی۔ ایس مکرجی، پتی چہرہ نسیم بانو کے چکر میں تھا۔ گیان مکرجی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ——— اپنے متعلق میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس کی جلد بہت پسند تھی۔ ایک دن میں نے شاہد لطیف سے اس کا ذکر کیا تو اس نے مسکرا کر کہا ،، جلد پسند ہے، ٹھیک ہے، لیکن تمہیں کیا معلوم کہ اندر کتاب کیسی ہے، مضمون کیسا ہے ؟"

پائی کی حالت اب بہت زیادہ مضحکہ خیز ہو گئی تھی اس لئے کہ پاروتی نے ایک روز اسے اپنے گھر مدعو کیا تھا اور اپنے ہاتھ سے اسے دو پیگ جونی واکر وسکی کے پلائے تھے۔ جب اس کو بہت زیادہ نشہ ہو گیا تھا تو پاروتی نے اس کو بڑے پیار سے اپنے صوفے پر لٹا دیا تھا ——— اب اس کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس پر مرتی ہے اور ہم

لوگ چونکہ ناکام رہے ہیں اس لئے حسد کی آگ میں جلتے ہیں ——
اس بارے میں پارو کا ردِ عمل کیا تھا، یہ مجھے معلوم نہیں۔

شوٹنگ جاری تھی۔ ویرا فلم کی ہیروئن تھی۔ سائڈ ہیروئن کا رول پارو کو ادا کرنا تھا۔ اسے برما کے کسی آزاد جنگلی قبیلے کی ایک شوخ و شنگ، تیز و طرار لڑکی کا روپ دھارنا تھا۔ جوں جوں اس کے مناظر کے فلمائے جانے کا وقت قریب آگیا میرے اندیشے بڑھتے گئے مجھے ڈر تھا کہ وہ امتحان میں پوری نہیں اترے گی اور ہم سب کی کوفت کا موجب ہوگی۔

آخر وہ دن آگیا جب اس کا پہلا "شوٹنگ ڈے" تھا۔ میک اپ اور کسٹیوم سے مزین ہو کر اسے کیمرے کے سامنے لایا گیا۔ عجیب و غریب تراش کی بھڑکیلے رنگوں والی پھنسی پھنسی چولی، ناف سے اور پیٹ کی ہلکی سی جھلک، گھٹنوں سے بالشت بھر اوپر لہنگا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کیمرے، مائک اور خیرہ کن روشنیوں سے قطعاً مرعوب یا خائف نہیں۔ مکالمہ اس کو اچھی طرح یاد کرا دیا گیا تھا۔ امید تھی کہ بول جائے گی۔ مگر جب "ٹیک" کا وقت آیا تو اس کا سارا وجود لکڑی ہو گیا۔ منہ کھولا تو مکالمہ سپاٹ، کئی ریہرسلیں کرائی گئیں مگر اس لکڑی میں جان کے آثار پیدا نہ ہوئے۔ پیشہ ور رقاصاؤں کی طرح

اپنے ابرو نچاتی تھی جیسے بھاؤ بتا رہی ہے۔ تین چار ریٹیک ہوئے تو میں بالکل مایوس ہو گیا۔ وا آپا طبعاً بہت جلد گھبرا جانے والا ہے کہ اس ایکٹنگ کی کوئی کل سیدھی نہیں تو اس نے ایس مکرجی سے کہا کہ وہی اس کو ٹھیک کرے۔

مکرجی اس کو کیا ٹھیک کرتا۔ وہ بنی ہی کچھ ایسے آب و گل سے تھی جس میں تناسب اور بھاؤ کرٹ کوٹ کے بھرے ستھے۔ چنانچہ ایک ریٹیک، میں اس نے کسی قدر گوارا ایکٹنگ کیا تو مکرجی نے غنیمت سمجھ کر صاد کر دیا۔

ہم سب نے بڑی کوشش کی کہ اس کا تصنّع اور چوبی پن کسی نہ کسی حیلے دور ہو جائے، مگر ناکام رہے۔ شوٹنگ جاری رہی اور وہ بالکل نہ سدھری۔ اس کو کیمرے اور مائک کا کوئی خوف نہیں تھا۔ مگر سیٹ پر وہ حسبِ منشا اداکاری کے جوہر دکھانے سے قاصر تھی — اس کی وجہ میر ٹھ کے مجروں کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ بہرحال ہمیں اتنی امید ضرور تھی کہ وہ کسی نہ کسی روز منجھ جائے گی۔

چونکہ مجھے اس کی طرف سے بہت مایوسی ہوئی تھی اس لئے میں نے اس کے رول، میں کتر بیونت شروع کر دی تھی۔ میری اس ،چالاکی، کا علم اسے پاٹی کے ذریعے سے ہو گیا۔ چنانچہ اس نے خالی

اوقات میں میرے پاس آنا شروع کر دیا۔ گھنٹوں بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہتی۔ بڑے شائستہ انداز میں، مناسب و موزوں الفاظ میں جن میں چاپلوسی کا رنگ نہیں ہوتا، میری تعریف کرتی۔

ایک دو مرتبہ اس نے مجھے اپنے گھر پر مدعو بھی کیا۔ میں شاید چلا جاتا، لیکن ان دنوں بہت مصروف تھا۔ ہر وقت میرے اعصاب پر پروپیگنڈا فلم کا منظر نامہ سوار رہتا تھا۔ یوں تو میرا ہاتھ بٹانے کے لئے تین آدمی موجود تھے۔ راجہ مہدی علی خاں ـــــ محسن عبداللہ اور ڈکشٹ ـــــ

راجہ مہدی علی خان نے تعاون سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس لئے کہ وہ ہر وقت اپنی روٹھی ہوئی بیوی کو خط لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ محسن عبداللہ وِیرا سے اپنے تعلقات مستحکم کرنے میں مشغول اور مسٹر ڈکشٹ۔ پارو کو مکالمے یاد کراتے رہتے تھے۔

میں کچھ عرصے سے نوٹ کر رہا تھا کہ پارو اور اشوک سیٹ پر جب آمنے سامنے آتے ہیں اور پارو کو اپنے ساحرانہ عشق کا اظہار کرنا ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں اشوک کی آنکھوں میں گڑھ جانا چاہتی ہیں ـــــ جیسے اس کو یہ بتانا مقصود ہے کہ دیکھو جو کچھ یہ ہو رہا ہے جھوٹ نہیں سچ ہے۔

اشوک طبعاً بہت جھینپو قسم کا آدمی ہے۔ وہ کسی عورت کے کھلم کھلا اظہارِ عشق کو برداشت نہیں کرسکتا ــــــ یہ مجھے معلوم تھا کہ اشوک کو پارو پسند ہے، لیکن اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس سے جسمانی تعلق پیدا کر لیتا ــــــ اس کی زندگی میں سینکڑوں نہیں، ہزاروں لڑکیاں آئیں ــــــ وہ لارڈ بائرن بن سکتا تھا مگر شرمیلی طبیعت کے باعث ان آسانی سے پھنس جانے والی تتلیوں سے اپنا دامن چھڑا کے بھاگ جاتا رہا۔

اشوک کمار کا یہ وہ زمانہ تھا جب وہ کسی بھی ایکٹرس پر ہاتھ ڈال سکتا تھا، بڑی آسانی سے، کئی ایکٹرسیں اپنا دل اس کے قدموں میں ڈالنے کے لئے تیار تھیں۔ میں نے سوچا اگر پارو کے دل میں بھی کھُد بُد ہو رہی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ــــــ پھر پارو تو وارد تھی۔ خود کو اشوک کے ساتھ ملسانک کرکے وہ بامِ شہرت پر بڑی جلدی پہنچ سکتی تھی۔

فلم میں پارو کا رول ایک آزاد قبیلے کی نیم جنگلی، خودسر اور جارحانہ قسم کا عشق کرنے والی لڑکی کا تھا۔ وہ اشوک سے محبت کرتی تھی۔ مگر وہ ویرا کے عشق میں گرفتار تھا۔ یہ فلمی تثلیث پارو کے اندرونی جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے کافی سامان بہم پہنچا رہی تھی۔

شوٹنگ جاری تھی۔ ان ڈور، آؤٹ ڈور ——— ایک دن کشتیوں کا سین فلمایا جانے والا تھا۔ اس کے لئے بہت دور ایک کھاڑی منتخب کی گئی۔ دو کشتیاں تھیں۔ ایک میں اشوک کو سوار ہونا تھا، دوسری میں پارو کو ——— اسے یہ ہدایت تھی کہ جب اس کی کشتی، اشوک کی کشتی کے پاس پہنچے تو وہ اس میں کود جائے۔

پانی بہت گہرا تھا جسب ہدایت پارو، اشوک کی کشتی میں کودی۔ مگر ایسا کرتے ہوئے دونوں کشتیوں میں فاصلہ کچھ زیادہ ہو گیا اور وہ پانی میں گر پڑی، وا آپا مدد کے لئے چلایا، فوراً ساحل پر سے دو تین مچھیرے پانی کے اندر گھسے اور پارو کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے۔

عورت ذات، مگر حیرت ہے کہ اس حادثے نے اسے بالکل خوفزدہ نہیں کیا تھا ——— کپڑے خشک ہوئے تو وہ فوراً دوسرے ٹیک کے لئے تیار تھی۔

جب وہ اپنے بھیگے ہوئے کپڑے نچوڑ رہی تھی تو میں نے اور اشوک نے اس کی ٹانگ کی ایک جھلک دیکھی جو کافی دلچسپ اور شریر تھی۔ جب ہم لوکیشن سے فارغ ہو کر گھر کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں اشوک نے مجھ سے کہا، "منٹو ——— ! ٹانگ بڑی اچھی تھی، جی چاہتا تھا روسٹ بنا کے کھا جاؤں!"

عجیب بات ہے کہ اشوک جیسا ڈھیٹ اور جھینپا اندرونی طور پر سادیت پسند تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ چونکہ اپنے جذبات دبا دینے کا عادی تھا۔ اس لئے ردِّ عمل کی صورت میں سادیت پیدا ہو گئی تھی۔

ڈسٹیبرا بم جی کار میں اشوک اور میں دونوں اسٹڈیو سے گھر واپس جایا کرتے تھے اور راستے میں اِدھر اُدھر کی مختلف باتیں کیا کرتے تھے —— موٹر اس سڑک پر سے بھی گزرتی تھی جس سے ملحقہ گلی میں پارو کا فلیٹ تھا۔ ایک شام جب ہم وہاں سے گزرے تو تھوڑی دور آگے نکل کر اشوک نے موٹر روک لی۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

مڑ کر اشوک نے اس گلی کی طرف دیکھا اور کہا "آج ہولی کی خوشی میں پارو نے دعوت دی ہے —— جاؤں یا نہ جاؤں؟"

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا "جاؤ!"

"تو چلو، تم بھی چلو!"

میں نے کہا "میں کیوں چلوں —— مجھے اس نے مدعو نہیں کیا۔"

"کوئی بات نہیں ——!" یہ کہہ کر اس نے تیزی سے موٹر گھمائی اور پارو کے فلیٹ کے پاس بریک لگائی۔ ہارن بجایا تو بالکنی

میں واچا اور پاپی نمودار ہوئے۔

پاپی نے مجھے دیکھا تو اپنے مکروہ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا "اوئے —— تم بھی آ گئے!"

واچا نے اشوک سے کہا "آؤ داداممنی آؤ —— تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔"

پارو خلافِ معمول بنارسی ساڑھی میں ملبوس دلہن سی بنی بیٹھی تھی۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے اٹھ کر استقبال کیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے بڑے مناسب و موزوں الفاظ میں معذرت کی کہ وہ مجھے مدعو کرنا بھول گئی۔

فوراً شراب کا دور شروع ہو گیا۔ پہلا پیگ ختم ہوا تو پاپی جھنجھلا نے لگا۔ واچا نے فرمائش کی کہ ایک آدھ گانا ہو جائے۔ پارو نے چنچلیاں کھانے والی نگاہوں سے اشوک کی طرف دیکھا اور کہا "کیوں اشوک صاحب! آپ کچھ سنیں گے؟"

اشوک جھینپ گیا اور اپنے مخصوص اکھڑ انداز میں صرف اتنا کہہ سکا "آپ گائیں گی تو میں سنوں گا۔"

گانا شروع ہوا۔ بازاری قسم کی ٹھمری تھی۔ اس کے بعد ایک غزل ہوئی۔ پھر کوئی فلمی گیت۔ اس دوران میں پارو کا شوہر باوجود کوئی بھی

وہ تھا گلاسوں میں شراب اور سوڈا انڈیلتا رہا۔ دوسرے پیگ کے بعد پاروتی کی آنکھیں مُندنے لگیں۔ اشوک زیادہ پینے کا عادی نہیں، اس لئے وہ ڈیڑھ پیگ سے آگے نہ بڑھا۔ داآجانے تیسرے پہ اپنے گلاس کا منہ بند کر دیا۔

ٹھمریاں، غزلیں، گیت بہت دیر تک ہوتے رہے۔ آخر میں جب اس نے بھجن سنایا تو اس نے میری موجودگی کا احساس کرکے ایک نعت شروع کی، لیکن میں نے فوراً اس کو روک دیا۔ "پارو دیوی! یہ محفلِ نشاط ہے —— شراب کے دَور چل رہے ہیں۔ یہاں کالی کملی والے کا ذکر نہ کیا جائے تو اچھا ہے!"

اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور مجھ سے معافی کی طلبگار ہوئی

کھانا بہت اچھا تھا —— اشوک جلدی فارغ ہو گیا۔ اس کے ہاتھ دُھلوانے کے لئے پارو اُٹھی —— جب اشوک واپس آیا تو وہ گھبرایا ہوا تھا۔ جلدی جلدی اس نے رخصت چاہی اور مجھے ساتھ لے کر وہاں سے چل دیا۔

راستے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ اس نے مجھے میرے گھر چھوڑا اور چلا گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ شوٹنگ بڑی باقاعدگی سے ہو رہی تھی ——

ایک شام جب میں اور اشوک واپس گھر جا رہے تھے تو شیوا جی پارک کے پاس جہاں پارو کا فلیٹ تھا، اشوک نے موٹر کی رفتار کم کی اور مجھ سے مخاطب ہوا "منو! تمھیں ایک دلچسپ بات بتاؤں؟"

اس کے لہجے میں کسی قدر ہچکچاہٹ تھی۔

میں نے ایک لحظے کے لئے سوچا کہ یہ دلچسپ بات کیا ہو سکتی ہے" بتاؤ!"

اشوک ہنسنے لگا "تمھیں یاد ہے، اس روز جب ہم پارو کے ہاں کھانا کھا رہے تھے، تو وہ میرے ہاتھ دھلانے کے لئے اٹھی تھی ——!

اشوک نے یہ کہا تو مجھے اس کی گھبراہٹ یاد آگئی" ہاں ہاں!"

" جب غسلخانے میں اس نے مجھے تولیہ دیا تو مجھ سے آہستہ سے کہا، کل آپ اکیلے آئیے —— شام کو ساڑھے چھ بجے —— میں گھبرا گیا اور تولیہ پھینک کر باہر نکل آیا۔ اشوک نے موٹر سڑک کے کنارے ٹھہرا لی۔

میں نے اس سے پوچھا "تم گئے؟"

" ہاں ——!" اشوک نے اسٹیرنگ وہیل سے ہاتھ ہٹائے اور انھیں زور زور سے ملنے لگا "لیکن وہاں سے بھی بھاگ آیا۔"

میں تفصیل جاننا چاہتا تھا "ہوا کیا —— پورا سینریو بتاؤ!"

" میں بڑا ڈرپوک ہوں —— جانے مجھے ایسے موقعوں پر کیا ہو جاتا ہے —— اس نے مجھے صوفے پر بٹھایا۔ آپ قالین پر میرے ساتھ لگ کر

بیٹھ گئی۔ دو پیگ مجھے پلائے۔ خود بھی تھوڑی سی پی اور پھر ــــ پھر وہ لگی اپنی محبت دکھانے ــــ میں سُنتا رہا اور کانپتا رہا جب اس نے میرا ہاتھ دبایا تو میں نے اسے بڑے زور سے جھٹک دیا ــــ اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے، لیکن فوراً کہیں غائب ہو گئے ــــ وہ مسکرانے لگی... بھیّا اشوک! میں تو آپ کا امتحان لے رہی تھی ــــ میں نے یہ سُنا تو چکرا گیا۔ اُٹھا تو اس نے پھر کہا، اشوک صاحب! میں تو آپ کو اپنا بھائی سمجھتی ہوں ــــ میں نے کچھ نہ کہا اور نیچے اُتر گیا ــــ کار میں بیٹھا ــــ گھر پہنچ کر میں نے آدھا پیگ پی کر سوچا تو مجھے بڑا افسوس ہُوا ــــ کیا ہرج تھا اگر میں ــــ" اشوک کے لہجے میں تاسف تھا۔

میں نے کہا " ہاں کوئی ہرج نہیں تھا"

اشوک کے لہجے میں تاسف اور زیادہ ہو گیا " اور ــــ مجھے وہ پسند بھی تھی!"

یہ سن کر میرے سامنے وہ منظر آ گیا جو اس واقعے کے روز رات کو نو بجے اسٹوڈیو کے باہر سخت سردی میں فلمایا جا رہا تھا۔ جشنِ مسرت میں لوگ ناچ گا رہے تھے ــــ اشوک اپنی ہیروئن ویرا کی باہوں میں باہیں ڈالے محوِ رقص تھا اور پارو ایک طرف مجسمۂ افسردگی بنی اکیلی کھڑی تھی ــــ!

انور کمال پاشا

اگر کسی اسٹوڈیو میں آپ کو کسی مرد کی بلند آواز سنائی دے۔ اگر آپ سے کوئی بار بار ہونٹوں پہ اپنی زبان پھیرتے ہوئے بڑے اونچے سروں میں بات کرے، یا کسی محفل میں کوئی اس انداز سے بول رہے ہیں جیسے وہ ساونڈ ٹسٹ کا تیل بیچ رہے ہوں تو آپ سمجھ جائیں گے کہ وہ حکیم احمد شجاع صاحب کے فرزند نیک اختر مسٹر انور کمال پاشا ہیں۔

انور کمال پاشا کا نام جب میں نے پہلی مرتبہ کسی اخبار میں دیکھا تو میرا دماغ اس انور پاشا کی طرف چلا گیا جو "ترکیہ" کا ہیرو تھا۔ بچپن میں ہم یہ پنجابی گانا گایا کرتے تھے

مصطفےٰ پاشا کمال دے تیریاں دوڑ بلایاں
کر بکرے یونانی حلال دے بیاو انگ قصائیاں
نال تیرے ہووے انور دی گھوڑی

آگے یاد نہیں رہا کیا تھا۔

مصطفےٰ پاشا کمال اور انور پاشا دونوں نے مل کر ہزاروں یونانی بکرے حلال کئے۔ لیکن بعد میں اُن دونوں میں چپقلش شروع ہو گئی اور ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔

میرا خیال ہے انور کمال پاشا نے ان دونوں شخصیتوں کو ذہنی طور پر متحد کرنے کے لئے یہ نام اختیار کیا۔ ہو سکتا ہے۔ کوئی اور مصلحت پیش نظر رہی ہو۔

لیکن اگر آپ انور کمال پاشا صاحب کو دیکھیں۔ تو اُن میں نہ تو مصطفےٰ کمال پاشا سا بھیڑیا پن (مورخ کمال اتاترک کو "گرے ولف" کہتے تھے) اور نہ انور پاشا کا سا تیکھا حسن۔۔۔۔۔ وہ، میرا مطلب ہے انور کمال پاشا، یا تو بھیڑیئے بننے کی کوشش میں بھیڑ بن کر رہ گئے ہیں۔ یا حسین بننے کی کوشش میں تھک ہار کر اپنے ہی خد و خال پر قناعت کر گئے ہیں۔

بہر حال کچھ بھی ہو۔ قیاس آرائیوں سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا

انور کمال پاشا کی شخصیت منفرد ہے۔ وہ انور پاشا کی آنکھوں کا بھیڑیا پن نہیں۔ تو ان میں ایک ہلکی سی چمک ضرور ہے۔ جو ظاہر کرتی ہے۔ کہ وہ دوسروں پر چھا جانے کی قوت رکھتے ہیں۔

جسمانی قوت تو خیر اُن میں اسی قدر ہو گی جتنی میرے جسم ناتواں میں ہے مگر وہ میری طرح دھونس جما کر اس کمی کو پورا کر ہی لیتے ہیں۔

فلمی دنیا میں در اصل بلند بانگ دعوے ہی با اثر ثابت ہوتے ہیں۔ ایک محاورہ ہے "پدرم سلطان بود"۔ لیکن اس کے برعکس انور کمال پاشا ہمیشہ یہ کہتے سنے گئے ہیں۔ کہ میرا باپ سلطان نہیں گذرا یا تھا سلطان تو میں ہوں۔

نفسیاتی اعتبار سے یہ نفی اکثر اوقات کارگر اور با اثر ثابت ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ انور کمال پاشا نفسیات کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ اسی لئے وہ اس گر کو بڑی بے تکلفی سے استعمال کرتے چلے آئے ہیں کہیں کہیں ٹھوکر بھی کھائی ہے۔ لیکن اُن کا اُلّو سیدھا ہوتا رہا ہے۔

وہ اپنے باپ کے ناخلف بیٹے نہیں۔ لیکن دنیوی کاروبار کیلئے دوسروں پر اپنا رُعب جمانے کے لئے شاید وہ ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ حسبِ ضرورت اپنے والدِ محترم کے متعلق یہ کہہ دیں کہ وہ تو جاہلِ مطلق ہیں اور اُن کے والدِ محترم کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ ہزار ہا

پاپڑ بیلنے کے بعد اتنا جان گئے ہیں۔ کہ میرا فرزند نیک اختر مجھے جاہلِ مطلق بنا کر ایک ایسی سیڑھی تعمیر کر رہا ہے۔ جس کے ذریعے سے آسمانِ بامِ عروج پر پہنچنا ہے۔

ابھی اس سیڑھی کے تمام زینے مکمل نہیں ہوئے۔ لیکن اُمید ہے کہ جلد ہو جائیں گے۔ اس لئے انور کمال پاشا بہت ممکن ہے کسی رستے کو کھڑا کر کے عرش تک پہنچ جائے۔ اور نامکمل سیڑھی کو حیرت زدہ چھوڑ جائے۔

اس میں شعبدہ بازی کے جراثیم موجود ہیں۔ جس طرح مداری اپنے منہ سے فٹ بال کی جسامت کے بڑے بڑے گولے نکالتا ہے۔ اسی طرح وہ بھی کوئی اس قسم کا سٹنٹ کر سکتا ہے۔

لیکن مجھے حیرت ہے اور یہ حیرت اس لئے کہ وہ چالاک نہیں۔ عیار نہیں۔ دغاباز نہیں۔ لیکن پھر بھی جب لوگ اس کے منہ سے فٹ بال جتنے گولے باہر نکلتے دیکھتے ہیں۔ تو کچھ عرصے کے لئے اس کی ساحری سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔

ہو سکتا ہے، بعد میں وہ اپنی حماقت پہ افسوس کریں کہ یہ تو محض فریبِ نظر تھا۔ یا گولے نکالنے میں کوئی خاص ترکیب استعمال کی گئی تھی۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ انور کمال پاشا اس دوران میں کوئی اور شعبدہ

ایجاد کر لیتا ہے۔ اس وقت وہ اپنا دوسرا فلم بنانے کے لئے سرمایہ دار دل سے، بہت ممکن ہے یہ کہہ رہا ہو۔ کہ میں اب کے ایسا فلم بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں، جو ہالی وڈ بھی نہیں بنا سکتا۔ اس میں کوئی ایکٹر ہوگا، نہ ایکٹرس۔ صرف کاٹھ کی پتلیاں ہوں گی جو بولیں گی۔ گانا گائیں گی اور ناچیں گی بھی ـــــ اور کلائمکس اس کا یہ ہوگا۔ کہ وہ گوشت پوست کی بن جائیں گی۔

انور کمال پاشا پڑھا لکھا ہے۔ ایم اے ہے۔ انگریزی ادب سے اُسے کافی شغف رہا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ وہ اپنے فلموں کی کہانی اسی سے مستعار لیتا ہے اور حسبِ ضرورت یا حسبِ لیاقت اُردو زبان میں ڈھال دیتا ہے۔ اس کے فلموں کے کردار ہمیشہ ڈرامائی انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ خود ڈرامائی انداز میں گفتگو کرنے کا عادی ہے۔ اس کی وجہ ایک اور بھی ہے۔ کہ اُس کے والد محترم جناب حکیم احمد شجاع صاحب کسی زمانے میں اچھے خاصے ڈرامہ نگار تھے۔ ان کا لکھا ہُوا ڈرامہ "باپ کا گناہ" بہت مشہور ہے۔

ایک لطیفہ سنیئے۔ انور کمال پاشا کے متعلق کسی جگہ گفتگو ہو رہی تھی۔ اس دوران میں ایک صاحب نے جن کا نام میں نہیں لینا چاہتا کہا "جی،

ہیں انور صاحب کو جانتا ہوں، وہ باپ کا گناہ ہیں۔"

انور کمال پاشا، بہر حال بڑی دلچسپ شخصیت کا مالک ہے، وہ اتنا بولتا۔ اتنا بولتا ہے۔ کہ اُن کے مقابلے میں اللہ کوئی نہیں بول سکتا۔ اصل میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ وہ اپنی آواز خود سُننا چاہتا ہے اور دل ہی دل میں داد دیتا ہے۔ کہ واہ، انور کمال، تو نے آج کمال کر دیا۔ تیرے مقابلے میں اور کوئی اتنا زبردست مقرر نہیں ہو سکتا۔

اگر آپ انسانی نفسیات کے متعلق کچھ جانتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ بعض انسانوں کو یہ مرض ہوتا ہے۔ کہ وہ ریکارڈ بن جائیں اور اُسے گراموفون کی سوئی تلے رکھ کر ہر وقت سُنتے رہیں۔ انور کمال پاشا بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

اس کے پاس اپنی گفتگوؤں کے کئی ریکارڈ ہیں۔ جو اپنی زبان کی سوئی کے نیچے رکھ کر بجانا شروع کر دیتا ہے۔ اور جب سارے ریکارڈ بج چکتے ہیں تو وہ ریڈیو کے فرمائشی پروگرام سُننے والے بچوں کے مانند خوش ہو کر محفل سے چلا جاتا ہے۔

اس کے خیالات میں "FIOCOATIAN" کو بہت زیادہ دخل ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟ یہ کوئی ماہر نفسیات ہی بتا سکتا ہے۔ اس کے اکثر فلموں میں دریا ضرور نظر آئے گا۔ اُس میں ضرور کوئی ڈوبے گا۔ اس

نے اب تک مندرجہ ذیل فلم بنائے ہیں۔ جن میں سے کچھ کامیاب رہے۔
اور کچھ ناکام۔

"دو آنسو"۔ "دلبر"۔ "غلام"۔ "گبھرو" اور "گمنام"۔

اگر آپ نے یہ فلم دیکھے ہیں۔ تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ ان میں کتنے فلموں میں دریا آتا ہے، جس میں اس کی کہانیوں کے کردار گرے ہیں۔ لیکن وہ موت کا قائل نہیں۔ وہ ان کو دریا میں گراتا ضرور ہے، مگر بعد میں بتاتا ہے کہ وہ ڈوبا نہیں تھا۔ یعنی مرا نہیں گیا تھا کسی نہ کسی ذریعے سے (انور کمال پاشا کے اپنے دماغ کی عجیب و غریب تخلیق ہوتا ہے) زندہ رہا تھا۔

معلوم نہیں، میں کہاں تک صحیح ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انور کمال پاشا کی زندگی بھی شاید ڈوب ڈوب کر زندہ رہنے سے دوچار رہی ہے۔

اس نے اپنی زندگی میں کئی ندیاں پار کی ہیں۔ ایک تو وہ تھی جو سہرے جلوے کی بیاہی ہوئی تھی۔ اس کو پار کرنے میں تو خیر اس کو کوئی دقت محسوس نہ ہوئی ہوگی۔ مگر جب اس کے سامنے وہ ندی جس کا نام شمیم تھا۔ بمبئی سے بہتی ہوئی لاہور آئی۔ تو اسے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن وہ ماہر تیراک کی مانند اسے بھی پار کر گیا۔

اس کو بہت دیر سے فلم بینی کا شوق تھا۔ بعد میں یہ شوق اس

دھن میں تبدیل ہو گیا۔ کہ وہ ایک فلم بنائے۔ جب شمیم سے اس کی راہ و رسم ہوئی۔ تو اس نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اور لاؤڈ سپیکر بن کہ ہر طرف گونجنے لگا "کہ آدمی فلم بنانا چاہتا ہوں۔ ہے کوئی سخی ایسا جو مجھے سرمایہ دے"۔

اس کی مسلسل صدا پر آخر کار اسے سرمایہ مل گیا۔ شمیم بمبئی میں ایک ایسی ندی تھی۔ جس کا پانی بہت صاف ستھرا تھا۔ اس میں کئی غواص تیر چکے تھے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ پانی جوہڑ کی طرح ٹھیر گیا۔ اس نے تیراکوں کے لئے وہ دلچسپی کا سامان نہ رہی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اسے اپنے وطن لاہور میں آنا پڑا۔

خیر اس قصے کو چھوڑیئے۔ یہ کوئی اصول اور لگا بندھا قاعدہ تو نہیں۔ لیکن عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے۔ فلم ڈائرکٹر، عورت کے فیصلے ہی سے آگے بڑھتے ہیں۔ اور پیچھے بھی اس کی وجہ سے ہٹتے ہیں۔ اور ایسے ہٹتے ہیں۔ یا ہٹائے جاتے ہیں۔ کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔

پاشا نے تھوڑی دیر کے بعد شمیم سے شادی کر لی جو اپنا تنگ ماتھا چوڑا کرنے کے لئے قریب قریب ہر روز اپنے بال نوچنے سے زخمی رہتی تھی۔ پاشا نے اس کی خوشنودیٔ خاطر کے لئے ضرور مصنوعی طور پر

اپنے سارے پر دبال نوچ کے اُس کے سامنے پلیٹ میں ڈال کر رکھ دیئے ہوں گے۔

میں اب اپنے مضمون کو مختصر کرنا چاہتا ہوں اس لئے کہ میں انور کمال پاشا کی طرح طوالت پسند ہونا نہیں چاہتا۔ وہ بہت دلچسپ شخصیت کا مالک ہے اور اس شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ بہت ڈھیٹ بھی ہے اور تلوّن مزاج بھی۔ بکواسی بھی اور بعض اوقات سنجیدہ مزاج بھی ––

اس کے کردار میں جو میں نے خاص بات دیکھی وہ یہ ہے کہ وہ متلوّن ٹھاٹ کا آدمی ہے اس کی طبیعت میں آجائے تو وہ آپ کا منہ موتیوں سے بھر دے گا اور اگر وہ "موڈ" میں نہیں۔ تو وہ آپ سے کوئی بات نہیں کرے گا۔

میں آپ کو اختتامی طور پر ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میں آج سے کچھ عرصہ پہلے شاہ نور اسٹوڈیوز میں تھا۔ جہاں انور کمال پاشا اپنے فلم "گمنام" کی شوٹنگ میں مصروف تھا۔

سردیوں کا موسم تھا۔ میں اپنے کمرے کے باہر کرسی پر بیٹھا۔ ٹائپ رائٹر میز پر رکھے کچھ سوچ رہا تھا۔ کہ پاشا اپنی کار سے اُترا اور میرے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ علیک سلیک ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس

نے مجھ سے کہا۔

"منٹو صاحب میں ایک سخت اُلجھن میں گرفتار ہوں۔"

میں نے اپنے خیالات جھٹک کر پوچھا۔

"کیا اُلجھن ہے آپ کو؟"

اُس نے کہا "یہ فلم جو میں بنا رہا ہوں، اس میں ایک مقام پر اٹک گیا ہوں، آپ کی رائے لینا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے آپ مشکل کشائی کر سکیں۔"

میں نے اُس سے کہا "میں حاضر ہوں۔ فرمائیے! آپ کہاں اٹکے ہوئے ہیں؟"

اس نے مجھے اپنے فلم کی کہانی سُنانا شروع کر دی۔ دو سین تفصیل سے اس انداز میں سُنائے۔ جیسے پولیس جیپ میں بیٹھی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے راہ چلتے لوگوں کو ہدایت کر رہی ہے۔ کہ انھیں بائیں ہاتھ چلنا چاہیئے۔ میں اپنی زندگی میں ہمیشہ اُلٹے ہاتھ چلا ہوں، اس لئے میں نے پاشا سے کہا۔

"آپ کو ساری کہانی سُنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ کس گڑھے میں پھنسے ہوئے ہیں۔"

پاشا نے حیرت آمیز لہجے میں مجھ سے پوچھا "آپ کیسے سمجھ گئے؟"

میں نے اس کو سمجھا دیا اور اس کی مشکل کا حل بھی بتا دیا۔ جب اس نے میری تجویز سنی تو اُٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا اس کے بعد اس نے کہا: "ہاں کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے"!

میں ذرا چڑ سا گیا: "حضرت اس سے بہتر حل آپ کو اور کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ مصیبت یہ ہے کہ میں فوری طور پر سوچنے کا عادی ہوں ——— اگر میں نے یہی حل آپ کو دس یا بارہ روز کے بعد پیش کیا ہوتا۔ تو آپ نے کہا ہوتا کہ سبحان اللہ۔ مگر اب کہ میں نے چند منٹوں میں آپ کی مشکل آسان کر دی ہے۔ تو آپ کہتے ہیں ہاں۔ کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو شاید اس مشورے کی قیمت معلوم نہیں"۔ پانشل نے فوراً اپنے پروڈکشن منیجر کو بلایا۔ اس سے چیک بک لی اور اس پر کچھ لکھا۔ چیک پھاڑ کر بڑے خلوص سے مجھے دیا: "آپ یہ قبول فرمائیں"۔ اس کے اصرار پر میں نے یہ چیک لے لیا ——— جو پانچ سو روپے کا تھا ——— یہ میری زیادتی تھی۔ اگر میں آسودہ حال ہوتا تو یقیناً میں نے یہ چیک پھاڑ دیا ہوتا لیکن انسان بھی کتنا ذلیل ہے یا اس کے حالاتِ زندگی کتنے افسوسناک ہیں۔ کہ وہ گراوٹ پر مجبور ہو جاتا ہے ——— !

میں اب اس مضمون کو ختم کرتا ہوں ——— انور کمال اپنے سہرے جلوے کی بیاہی بیوی سے بچے پیدا کرتا ہے جن کی نگہداشت شمیم کرتی

ہے ۔ وہ ریل گاڑی ہے ۔جو مسافروں کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے ۔ اور انور کمال پاشا انجن ڈرائیور ہے جو اس کے پیٹ میں ایندھن جھونکتا رہتا ہے ۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ریل گاڑی کے انجن کی ایسی سیٹی ہے جو رات کی خاموش فضا میں " فیڈ آوٹ " ہو رہی ہے ۔

کے کے

یہ اُس مشہور ایکٹرس کا نام ہے جو ہندوستان کے متعدد فلموں میں آچکی ہے۔ اور آپ نے یقیناً اُسے سیمیں پردے پر کئی مرتبہ دیکھا ہوگا۔ میں جب بھی اُس کا نام کسی فلم کے اشتہار میں دیکھتا ہوں تو میرے تصور میں اُس کی شکل بعد میں، لیکن سب سے پہلے اُس کی ناک اُبھرتی ہے —— تیکھی، بہت تیکھی ناک۔ اور پھر مجھے بمبے ٹاکیز کا وہ دلچسپ واقعہ یاد آجاتا ہے، جو میں اب بیان کرنے والا ہوں۔

بٹوارے پر جب پنجاب میں فسادات شروع ہوئے، تو کلدیپ کور جو لاہور میں تھی، اور وہاں فلموں میں کام کر رہی تھی، ہجرت کرکے بمبئی چلی گئی۔ اُس کے ساتھ اُس کا داشتہ پران بھی تھا، جو پنچولی کے کئی فلموں میں کام کرکے

شہرت حاصل کر چکا تھا۔

اب پرآن کا ذکر آیا ہے، تو اُس کے متعلق بھی چند تعارفی سطور لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ پرآن اچھا خاصا خوش شکل مرد ہے۔ لاہور میں اُسکی شہرت اس وجہ سے بھی تھی کہ وہ بڑا ہی خوش پوش تھا۔ بہت ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ اُس کا تانگہ گھوڑا، لاہور کے رئیسی تانگوں میں سے زیادہ خوبصورت اور دلکش تھا۔

مجھے معلوم نہیں، پرآن سے کلدیپ کور کی دوستی کب اور کس طرح ہوئی۔ اس لئے کہ میں لاہور میں نہیں تھا۔ لیکن فلمی دُنیا میں دوستیاں عجائب میں داخل نہیں۔ وہاں ایک فلم کی شوٹنگ کے دوران میں ایکٹرسوں کا دوستانہ بیک وقت کئی مردوں سے ہو سکتا ہے۔ جو اس فلم سے وابستہ ہوں۔

جن دنوں پرآن اور کلدیپ کور کا معاشقہ چل رہا تھا۔ ان دنوں شیام مرحوم بھی وہیں تھا۔ پونہ اور بمبئی میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد وہ لاہور چلا گیا تھا۔ جس سے اسے والہانہ محبت تھی۔ عشق پیشہ انسان تھا اور کلدیپ بھی اس میدان میں اُس سے پیچھے نہیں تھی۔۔۔ دونوں کا تصادم ہوا۔ قریب تھا کہ وہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے کہ ایک اور لڑکی شیام کی زندگی میں داخل ہو گئی۔

اس کا نام ممتاز تھا جو تاجی کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ زیب قریشی ایم۔ اے کی چھوٹی بہن تھی۔ کلدیپ کو شیام کی یہ کلا بازی پسند نہ آئی چنانچہ وہ

اُس سے ناراض ہوگئی! اور ہمیشہ ناراض رہی۔ میں یہاں آپ کو یہ بتادوں کہ کلدیپ
بڑی ہٹیلی عورت ہے۔ جو بات اس کے دماغ میں سما جائے اس پہ اڑی رہتی ہے۔
میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ یہ واقعہ بمبئی کا ہے۔

ہم تینوں بمبئی ٹاکیز میں تھے اور شام کو برقی ٹرین سے اپنے گھر جا رہے تھے۔
فرسٹ کلاس کا ڈبہ اس دن قریباً قریباً خالی تھا۔ ہم تینوں کے سوا اس میں اور
کوئی مسافر نہ تھا۔

شیام طبعاً بڑا بلند بانگ اور منہ پھٹ تھا جب اُس نے دیکھا کہ کمپارٹمنٹ
میں کوئی غیر نہیں تو اُس نے کلدیپ کور سے چھیڑ خانی شروع کردی۔ لیکن میں
سمجھتا ہوں کہ اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ رشتہ جو لاہور میں قائم ہوتے ہوتے رہ گیا
تھا اب یہاں بمبئی میں قائم ہو جائے۔ کیونکہ تاجی سے اُس کی کھٹ پٹ ہوگئی تھی
رمولا کلکتہ میں تھی اور نگار سلطانہ نغمہ نویس مدھوک کے پاس۔ وہ ان دنوں
بقول اس کے "خالی ہانڈی" تھا۔

چنانچہ اُس نے کلدیپ کور سے کہا کہ تم مجھ سے دُور دُور کیوں رہتی
ہو ادھر آؤ میری جان میرے پاس بیٹھو۔ کلدیپ کی ناک اور تیکھی ہوگئی۔

"شیام صاحب آپ مجھ پر ڈورے نہ ڈالیں!"

میں ان کی گفتگو جو مجھے مکمل طور پر یاد ہے یہاں نقل کرنا نہیں چاہتا اس لئے
کہ وہ بہت بیباک تھی۔ ویسے اس کی روح اپنے لفظوں میں بیان کئے دیتا ہوں

شیام کبھی سنجیدگی سے بات نہیں کرتا تھا۔ اس کے ہر لفظ میں ایک قہقہہ ہوتا تھا
اس نے کلدیپ سے اسی مخصوص انداز میں کہا "جان من اس اُلّو کے پیچھے پڑنا
کو چھوڑ دو اور میرے ساتھ ناطہ جوڑ لو۔ وہ میرا دوست ہے لیکن یہ معاملہ بڑی
آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔"

کلدیپ کور کی آنکھیں اس کی ناک کی طرح بڑی اور تیکھی ہیں۔ اس کا
لب دہان بھی بڑا تیکھا ہے۔ اس کے چہرے کا ہر خد و خال تیکھا ہے جب وہ
اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھپکا کر بات کرتی ہے۔ تو آدمی بوکھلا جاتا ہے۔ کہ یہ کیا
مصیبت ہے۔

اس نے تیز تیز نگاہوں سے شیام کی طرف دیکھا اور اُس سے زیادہ تیز
لہجے میں اس سے کہا "منہ دھو رکھیئے شیام صاحب"۔ شیام پر عورتوں کی
تیز گفتاری کا بھلا کہاں اثر ہوتا اُس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا کہ میری
جان تم لاہور میں مجھ پر مرتی تھیں۔ یاد نہیں تمہیں۔

اب کلدیپ نے قہقہہ لگایا جس میں نسوانی طنز بھرا تھا "آپ کو وہم ہو گیا تھا"

شیام نے کہا "تم غلط کہتی ہو تم یقیناً مجھ پر مرتی ہو۔

میں نے کلدیپ کی طرف دیکھا اور مجھے محسوس ہوا کہ اس کے جسم پر سپردگی
کی خواہش موجود ہے۔ مگر اس کا ہٹیلا دماغ اس کی اس خواہش کو رد کرنے کی
کوشش میں مصروف ہے چنانچہ اُس نے اپنی تیکھی پلکیں پھڑپھڑا کر کہا۔

"مرتی تھی لیکن اب نہیں مروں گی۔"

شیام نے اپنے اسی لاابالیانہ انداز میں کہا اب نہیں، مرو گی تو کل

مردگی۔ مرنا بہرحال تمہیں مجھ پر ہی ہے۔

کلدیپ کور بھنا گئی "شیام تم مجھ سے آج آخری بار سن لو کہ تمہارا میرا کوئی سلسلہ نہیں ہو سکتا۔ تم اتراتے ہو۔ ہو سکتا ہے لاہور میں کبھی میری طبیعت تم پر آئی ہو لیکن جب تم نے لیے رُخی برتی تو میں کیوں تمہیں منہ لگاؤں۔ اب اس قصہ کو ختم کرو۔

قصہ ختم ہو گیا۔ صرف وقتی طور پر کیونکہ شیام زیادہ بحث بحثی کا عادی نہیں تھا کلدیپ کور اٹاری کے ایک مشہور و معروف اور مالدار سکھ گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اس کا ایک فرد لاہور کی ایک مشہور مسلمان عورت سے منسلک ہے جس کو اس نے لاکھوں روپے دیئے اور دیتا ہے کہ اب بھی دیتا ہے۔

یہ مسلمان عورت کسی زمانے میں یقیناً خوبصورت ہو گی مگر اب موٹی اور بھدی ہو گئی ہے۔ مگر وہ اٹاری کے سکھ حضرت اب بھی باقاعدہ یہاں لاہور میں فلیٹی ہوٹل میں آتے ہیں اور اپنی مسلمان محبوبہ کے ساتھ چند روز گذار کر واپس چلے جاتے ہیں۔

جب بٹوارہ ہوا تو کلدیپ کور اور پھر ان کو افراتفری میں لاہور چھوڑنا پڑا۔ پر ان کی موٹر (جو غالباً کلدیپ کور کی ملکیت تھی) یہیں رہ گئی لیکن کلدیپ کور ایک باہمت عورت ہے۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مردوں کو اپنی انگلیوں پر نچا سکتی ہے۔ اس کے لیے وہ کچھ دیر کے بعد لاہور آئی اور فسادات کے دوران میں یہ موٹر خود چلا کر بمبئی لے گئی۔

جب میں نے موٹر دیکھی اور پھر اس سے پوچھا کہ یہ کب خریدی گئی ہے۔ تو اس نے مجھے سارا واقعہ سنایا کہ کیسے وہ لاہور سے لیکر آئی ہے۔ اور یہ کہ

راستے میں اُسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی ایک صرف دہلی میں اسے چند روز ٹھہرنا پڑا کہ ایک گڑبڑ ہو گئی تھی یہ گڑبڑ کیا تھی اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔

جب وہ موڑلے کر آئی تو اس نے سکھوں پر مسلمانوں کے مظالم بیان کئے اور اس انداز سے بیان کئے کہ معلوم ہوتا تھا وہ میز پر سے مکھن لگانے والی چھری اُٹھائے گی اور میرے پیٹ میں گھونپ دے گی۔ لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جذباتی ہو گئی تھی ورنہ مسلمانوں سے کوئی عداوت یا بغض نہیں۔

اصل میں اس کا کوئی مذہب نہیں وہ صرف عورت ہے، ایک ایسی عورت جو جسمانی لحاظ سے بڑی پُر خلوص ہے۔

اس کی ناک بجائے تیکھی ہے۔ اس کی آنکھیں بہت تیز ہیں۔ اس کا لب دہان بہت باریک ہے ——

یہی وجہ ہے کہ اس کے چہرے پہ ذرا سا چڑھاؤ بہت تیز و تند بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا لہجہ اور اسکی آواز بھی غیر معمولی طور پر تند و طرارے۔

کلدیپ کور کی تیکھی ناک کا ذکر میں کئی بار کر چکا ہوں اس سلسلے میں آپ ایک لطیفہ سن لیجئے۔

میں فلمستان چھوڑ کر اپنے دوست اشوک کمار اور ساوک واچا کے ساتھ بمبئی ٹاکیز چلا گیا تھا اس زمانے میں فسادات کا آغاز تھا۔ اسی دوران میں کلدیپ کور اور اس کا داشتہ پران ملازمت کے لئے وہاں آیا۔

پران سے جب میری ملاقات شیام کے توسط سے ہوئی تو میری اُسکی فوراً دوستی ہو گئی۔ بڑا بے ریا آدمی ہے۔ کلدیپ کور سے البتہ کچھ رسمی قسم

کی ملاقات رہی۔

ان دنوں تین فلم ہمارے اسٹوڈیو میں شروع ہونے والے تھے چنانچہ جب کلدیپ کور نے مسٹر سلوک واچا سے ملاقات کی۔ تو انہوں نے جوزف واشنگ جرمن کیمرہ مین سے کہا کہ وہ اس کا کیمرہ ٹیسٹ کر دے تاکہ اطمینان ہو جائے۔

واشنگ گورے رنگ اور ادھیڑ عمر کا موٹا سا آدمی ہے، اس کو ہمانسو رائے مرحوم اپنے ساتھ جرمن سے لائے تھے۔ جب جنگ شروع ہوئی تو اسے دیولالی میں نظر بند کر دیا گیا۔ ایک عرصہ تک وہاں رہا۔ جب جنگ ختم ہوئی۔ تو اسے رہا کر دیا گیا اور وہ پھر واپس بمبئی ٹاکیز میں آ گیا۔ اس لئے کہ مسٹر واچا سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ کیونکہ وہ عرصہ ہوا بمبئی ٹاکیز میں اکٹھے ایک دوسرے کے ساتھ کام کرتے رہے تھے۔ ان دنوں مسٹر واچا ساؤنڈ ریکارڈسٹ تھے۔

واشنگ نے اسٹوڈیو میں روشنی کا انتظام کرایا اور میک اپ مین سے کہا کہ وہ کلدیپ کور کو تیار کر کے کیمرہ ٹیسٹ کے لئے لائے۔ وہ خود تیار تھا۔ کیمرہ تیار تھا۔ اس کو اس نے اچھی طرح دیکھا۔ روشنیاں درست کرائیں اور اپنا چرٹ سلگائے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

کلدیپ کور آئی میں نے اسے دیکھا اس کی ناک پر میک اپ مین نے سرخی اور سفیدے کے کچھ ایسے خط لگائے تھے کہ وہ دس گنا اور نکیلی ہو گئی تھی۔ جب واشنگ نے اس کو دیکھا تو وہ گھبرا گیا کیونکہ وہ ہڑا پا ناک تھی۔

کلدیپ کور بالکل بے خوف بے جھجک کیمرے کے سامنے کھڑی ہو گئی

واشنگ نے اب اس کر کبرے کی آنکھ سے دیکھا مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کو بڑی اُلجھن ہو رہی ہے وہ اس کی ناک ایسے زاویے پر بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ معیوب معلوم نہ ہو۔

بیچارہ اس کوشش میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ آخر اُس نے تھک ہار کر مجھ سے کہا میں اب ایک کپ چائے پیوں گا۔ میں سارا معاملہ سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں کنٹین میں پہنچ گئے وہاں اُس نے اپنا پسینہ پونچھتے ہوئے مجھ سے کہا، مسٹر منٹو اسکی ناک بھی ایک آفت ہے کیمرے میں گھُسی چلی آتی ہے۔ چہرہ بعد میں آتا ہے ناک پہلے آتی ہے اب میں کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آتا میں نے کہا "تم جانو تمہارا کام جانے۔"

پھر اُس نے ایک اور اُلجھن کا اظہار کیا لیکن وہ میرے کان میں "مسٹر منٹو --- اس کا وہ معاملہ ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن میں اس سے کیسے کہوں اور یہ کہہ کر موٹے واشنگ نے اپنا پسینہ پھر پونچھا۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا لیکن واشنگ نے پھر بھی مجھے وضاحت سے سب کچھ بتا دیا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں کے کے سے درخواست کروں کہ وہ اس معاملے کو ٹھیک کرے کہ وہ بہت ضروری ہے ناک کا وہ کوئی نہ کوئی زاویہ نکال لے گا۔ مگر اس معاملے کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا کہ وہ یہ اس کا کام ہے۔ میں نے اس کی تشفی کی کہ میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ کیونکہ اُس نے مجھے اس معاملے کی درستی کا حل بتا دیا تھا کہ جو پینتیس روپے میں وائٹ وے اینڈ لیڈلا کی دکان سے دستیاب ہو سکتا تھا۔

اِس روز ٹیسٹ کسی بہانے موقوف کر دیا گیا۔ کلدیپ جب اسٹوڈیو سے باہر نکلی تو میں نے بے تکلفی سے ساری بات جو اِس معاملے کے متعلق تھی بتا دی اور اس سے کہا کہ وہ آج ہی فورٹ میں جاکر وہ چیز خرید لے جس سے اس کے جسم کا نقص دُور ہو جائے گا۔ اس نے بلا جھجک میری بات سُنی اور کہا کہ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ چنانچہ وہ اِسی وقت پرآن کے ساتھ گئی اور وہ چیز خرید لائی جب دوسرے روز اسٹڈیو میں اس سے ملاقات ہوئی تو زمین و آسمان کا فرق تھا۔ یہ چیز بھی ایجاد کرنے والے بھی بلا کے آدمی ہیں۔ جو یوں چٹکیوں میں "معاملوں" کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔

واشنگ نے جب اسے دیکھا تو وہ مطمئن تھا۔ گو کلدیپ کی ناک اسے تنگ کر رہی تھی مگر اب دوسرا معاملہ بالکل ٹھیک تھا چنانچہ اُس نے ٹیسٹ لیا اور جب اس کا پرنٹ تیار ہوا اور ہم سب نے اسے اپنے پروجیکشن ہال میں دیکھا تو اس کی شکل و صورت کو پسند کیا اور یہ رائے متفقہ طور پر قائم ہوئی کہ وہ خاص رولز کے لئے بہت اچھی رہے گی خصوصاً ویمپ رول کے لئے۔ کلدیپ کور سے مجھے زیادہ ملنے جلنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ پرآن چونکہ دوست تھا اور اس کے ساتھ اکثر شامیں گزرتی تھیں اس لئے کلدیپ بھی کبھی کبھی ہمارے ساتھ شریک ہو جاتی تھیں وہ ایک ہوٹل میں رہتی تھی۔ جو ساحلِ سمندر کے پاس تھا پرآن بھی اس سے کچھ دُور ایک سکوبل میں مقیم تھا جہاں اس کی بیوی اور بچہ بھی تھا۔ لیکن اس کا زیادہ وقت کلدیپ کور کے ساتھ گزرتا تھا میں اب آپ کو ایک دلچسپ واقعہ

سُناتا ہوں۔

میں اور شیام تاجی ہوٹل میں بیئر پینے جا رہے تھے کہ راستے میں مشہور نغمہ نویس مدھوک سے ملاقات ہو گئی وہ ہمیں "ابروس سینما" کی بار میں لے گئے وہاں ہم سب دیر تک بیئر نوشی میں مشغول رہے۔ مدھوک ٹیکسیوں کا بادشاہ مشہور رہے۔ باہر ایک گرانڈیل ٹیکسی کھڑی تھی۔ یہ مدھوک صاحب کے پاس تین دن سے تھی۔

جب ہم فارغ ہوئے تو انھوں نے پوچھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔

مدھوک صاحب کو اپنی محبوبہ نگار سلطانہ کے پاس جانا تھا جس سے کسی زمانے میں شیام کا بھی تعلق تھا۔ اور کلاریپ کور بھی اس کے آس پاس ہی رہتی تھی۔ شیام نے مجھ سے کہا چلو پرآن سے ملتے ہیں۔

چنانچہ مدھوک صاحب کی ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم وہاں پہنچے۔ وہ تو اپنی نگار سلطانہ کے پاس چلے گئے اور ہم دونوں کلاریپ کور کے ہاں۔ پرآن وہاں بیٹھا تھا۔ ایک مختصر سا کمرہ تھا بیئر پی ہوئی تھی۔ غنودگی طاری ہوئی تھی۔ اس کو زائل کرنے کے لئے شیام نے سوچا کہ تاش کھیلنی چاہیے۔ کلاریپ فوراً تیار ہو گئی لیکن یہ کہا کہ فلش ہوگی۔ ہم مان گئے۔

فلش شروع ہو گئی۔ کلدیپ اور پرآن ایک ساتھ تھے۔ پرآن ہی پتے بانٹتا تھا وہی اُٹھاتا تھا۔ اور کلدیپ اس کے کاندھے کے ساتھ اپنی نوکیلی ٹھوڑی ٹکائے بیٹھی تھی۔ البتہ جتنے روپے پرآن جیتتا تھا اُٹھا کر اپنے پاس رکھ لیتی۔

اِس کھیل میں ہم صرف ہارا کئے۔ میں نے فلش کئی مرتبہ کھیلی ہے لیکن وہ فلش کچھ عجیب و غریب قسم کی تھی۔ میرے پچھتّر روپے پندرہ منٹ کے اندر اندر کلدیپ کور کے پاس تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آج پتّوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ٹھکانے کے آتے ہی نہیں۔

شیام نے جب یہ رنگ دیکھا تو مجھ سے کہا۔ منٹو اب بند کر دو۔ میں نے کھیلنا بند کر دیا۔ پرآن مسکرایا اور اُس نے کلدیپ سے کہا کہ سکے پیسے واپس کر دو منٹو صاحب کے۔

میں نے کہا یہ غلط ہے۔ تم لوگوں نے جیتے ہیں۔ واپسی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اِس پر پرآن نے مجھے بتایا کہ وہ اوّل درجے کا ذرباز ہے اُس نے جو کچھ مجھ سے جیتا ہے اپنی چابکدستی کی بدولت مجھ سے جیتا ہے۔ چونکہ میں اس کا دوست ہوں اس لئے وہ مجھ سے دھوکا کرنا نہیں چاہتا۔ میں پہلے سمجھا کہ وہ اس حیلے سے میرے روپے واپس کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جب اُس نے تاش کی گڈی اُٹھا کر تین چار بار پتّے تقسیم کئے۔ اور ہر بار بڑے داؤ جیتنے والے پتّے اپنے پاس گرائے تو میں اُس کے ہتھکنڈے کا قائل ہو گیا۔ یہ کام واقعی بڑی چابکدستی کا ہے۔ پرآن نے پھر کلدیپ کور سے کہا کہ وہ روپے واپس کر دے مگر اُس نے انکار کر دیا۔ شیام کباب ہو گیا۔ پرآن ناراض ہو کر چلا گیا۔ غالباً اِسے اپنی بیوی کے ساتھ کہیں جانا تھا۔ شیام اور میں وہیں بیٹھے رہے تھوڑی دیر شیام اُس سے گفتگو کرتا رہا۔ پھر اُس نے کہا آؤ چلو سیر کریں کلدیپ راضی ہو گئی۔

ٹیکسی منگوائی گئی ہم سب باٹی کھلہ روانہ ہوئے۔ کلیر روڈ پر میرا فلیٹ تھا ہم سیدھے وہاں پہنچے گھر میں ان دنوں کوئی بھی نہیں تھا۔ شیام میرے ساتھ رہتا تھا۔ ہم فلیٹ میں داخل ہوئے تو شیام نے کلدیپ سے چھیڑ خانی شروع کر دی۔ کلدیپ بہت جلد تنگ آنے والی عورت نہیں وہ کسی مرد سے گھبراتی بھی نہیں۔ اس کو خود پر پورا پورا اعتماد ہے چنانچہ وہ دیر تک شیام کے ساتھ ہنستی کھیلتی رہی۔

ہاں میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا۔ کہ جب ہم کلیر روڈ پر پہنچے تو کلدیپ نے ایک اسٹور کے پاس ٹیکسی روکنے کے لئے کہا کہ وہ سینٹ کی شیشی خریدنا چاہتی ہے۔ شیام سخت کباب تھا کہ وہ اس روپے سے ہر چیز خریدے گی جو پہ آن نے نوبر بازی کے ذریعے سے مجھ سے جیتے تھے پر میں نے اس سے کہا کوئی ہرج نہیں تم اس بات کا کچھ خیال نہ کرو۔ ہٹاؤ اس قصے کو۔ کلدیپ کے ساتھ میں اسٹور میں گیا اُس نے پارڈے کا سینٹ پسند کیا اس کی قیمت بائیس روپے آٹھ آنے تھی۔ کلدیپ نے خوبصورت شیشی اپنے پرس میں رکھی اور مجھ سے کہا منٹو صاحب قیمت ادا کر دیجئے۔

میں اس سینٹ کے دام ہر گز ادا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر دکاندار میرا واقف تھا۔ اور پھر ایک عورت نے اس انداز سے مجھ سے قیمت ادا کرنے کو کہا تھا کہ انکار کرنا مردانہ وقار کی تذلیل کا باعث ہوتا۔ چنانچہ میں نے جیب سے روپے نکالے اور ادا کر دیئے۔ فلیٹ میں جب شیام کو معلوم ہوا کہ سینٹ میں نے خرید کر دیا ہے۔ تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اُس نے مجھے اور

کلدیپ کور کو پیٹ بھر کر گالیاں دیں۔ لیکن بعد میں نرم ہو گیا اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ کلدیپ کسی نہ کسی طرح رام ہو جائے۔ میں نے بھی کوشش کی اور کلدیپ کور کو سمجھایا کہ اب اس کے اختلافات مٹ جانے چاہئیں کلدیپ مان گئی میں نے شیام اور اس سے کہا کہ میں جاتا ہوں تم دونوں آپس میں سمجھوتہ کر لو مگر اُس نے کہا کہ نہیں یہ سمجھوتہ اس کے ہوٹل میں ہوگا ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ دونوں اس میں چلے گئے۔

میں خوش تھا کہ چلو یہ قصہ طے ہوا۔

مگر پون گھنٹے بعد ہی شیام لوٹ آیا۔ سخت غصے میں بھرا ہوا تھا میں نے اُسے جب برانڈی کا گلاس پیش کیا تو میں نے دیکھا کہ اُس کا ہاتھ زخمی ہے۔ خون بہہ رہا ہے۔ میں نے بڑی تشویش کے ساتھ پوچھا۔ وہ کباب تھا لیکن برانڈی نے اُس کے موڈ کو کسی قدر درست کر دیا۔ اس نے بتایا کہ جب وہ کے ساتھ اُس کے ہوٹل میں پہنچا اور وہ ٹیکسی سے باہر نکلے تو وہ رکلدیپ کو گالی دے کر ہمکلم ہو گئی۔ مجھے سخت غصہ آیا ہم دونوں ایک پتھریلی دیوار کے پاس کھڑے تھے میں نے اُس سے کہا تم لاہور میں مجھ پر مرتی تھیں۔ اب یہ کیا نخرہ ہے۔ اُس نے جواب میں کچھ ایسی بات کہی کہ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے تان کر گھونسہ مارا مگر وہ ——— ایک طرف ہٹ گئی اور میرا گھونسہ دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا۔ وہ ہنسی قہقہے لگاتی اُوپر ہوٹل میں چلی گئی اور میں کھڑا اپنا زخمی ہاتھ دیکھتا رہا۔

کلدیپ کور عجیب و غریب شخصیت کی مالک ہے۔ جس طرح اسکی ناک تیکھی ہے اسی طرح اس کا کردار تیکھا اور نوکیلا ہے۔

پچھلے دنوں یہ خبر آئی تھی کہ اس پر ہندوستان میں پاکستان کی جاسوسی کا الزام لگایا گیا ہے معلوم نہیں اس میں کہاں تک صداقت ہے لیکن میں وثوق سے اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس جیسی عورت ماتا ہری کبھی نہیں بن سکتی جس کا ظاہر باطن ایک ہو۔

سعادت حسن منٹو

منٹو نہ تو کسی کو شرم دلاتا ہے نہ کسی کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہے۔ وہ تو بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انسانوں سے یہ کہتا ہے کہ تم اگر چاہو بھی تو بھٹک کے بہت دُور نہیں جا سکتے۔ اس اعتبار سے منٹو کو انسانی فطرت پر نہیں زیادہ بھروسہ نظر آتا ہے۔

محمد حسن عسکری

"منٹو نے زندگی کے زہراب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ چھوا ہے، چکھا ہے اور اب وہ ایک نشتر بن کر سماج کے فاسد مادے کو خارج کرنا چاہتا ہے۔ مریض چیختا ہے، چلاتا ہے، بین کرتا ہے، منٹو کو اس کی پرواہ نہیں وہ اس قدر بےرحم ہے کہ کلوروفارم دینا بھی پسند نہیں کرتا۔

کرشن چندر

"منٹو آدم کی جراٗتِ گناہ کا قائل ہے۔ منٹو کا انسان نُوری ہے نہ ناری، وہ آدمِ خاکی ہے —— وہ وجود خاکی جس میں بنیادی گناہ، فساد، قتل وخون وغیرہ کے باوجود۔ خدا نے نوری فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔

ممتاز شیریں